رسائل
۳۹۷
ہندستانی ادب
حیدرآباد دکن
غلام محمد خاں ام۔ اے (عثمانیہ)

ہندستانی ادب

میں

اشتہار کی اجرت

صفحہ	ایک سال	چھ مہینے	تین مہینے	ایک مہینہ
پورا صفحہ	لشہ	ے للعہ ۴۲	ے عہ ۲۲	ے عہ ۱۲
آدھا صفحہ	للعہ ۴۰	ے عہ ۲۲	ے عہ ۱۳	۸حہ
پاؤ صفحہ	عہ ۲۰	لہ عہ ۱۱	ے ۶	للعہ ۴

منیجر ”ہندستانی ادب“

(پتہ)

اعظم پورہ حیدرآباد دکن

تار کا پتہ
ادب حیدرآباد دکن
قیمت ایک پرچہ
۶/

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۸۴)
برڈ برطانیہ (۴۴۳۴)
چندہ سالانہ
(للعہ)

ہندستانی ادب

ایڈیٹر۔ غلام محمد خاں ایم۔ اے (عثمانیہ)

جلد (۳) فروردی ۱۳۵۲ف فروری ۱۹۴۳ء نمبر (۵)

فہرست مضامین

ایڈیٹر
غلام محمد خا

ارے خیالات

حجم کی کمی پچھلے نمبر میں حجم کی کمی کے سلسلے میں ہم نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ایک تو کاغذ کی کمی اور دوسرے بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب ہم اس رسالے کا حجم کم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان ناخوشگوار حالات کے بعد بھی اگر ہندستانی ادب کے خریدار ساتھ دیتے تو شاید ہم یہ مختصر سا رسالہ نکالنے پر مجبور نہ ہوتے۔ جیسا کہ ہم نے اپنے پچھلے نمبروں میں لکھا تھا ہماری یہ تمام کوششیں محض علم و ادب اور زبان کی خدمت کے لیے ہیں اس کام سے پیسہ کمانا ہرگز ہمارا مقصد نہیں ہے۔ مگر سب جانتے ہیں کہ کوئی کام کرنے والا کب تک ایثار اور قربانی سے کام لے سکتا ہے۔ خصوصاً ایسے ہڑبونگ کے زمانے میں جبکہ پوری دنیا مہنگائی کا شکار ہو گئی ہے۔

ہماری عین آرزو تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے ہم حجم کو بڑھا کر زیادہ سے زیادہ ٹھوس علمی ادبی قسم کے مضامین تحقیقی مقالے معیاری افسانے اور بلند پایہ نظمیں پیش کرتے رہیں۔ اگرچہ کسی حد تک ہندستانی ادب نے اپنے معیار کو اب تک قایم رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے لیکن صفحوں کے اعتبار سے اس کا اپنا اصلی معیار قایم نہ رہ سکا اس سلسلے میں ہماری وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں اس لیے کہ صحافتی دنیا اور اس سے متعلقہ لوگ زمانے کی مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہیں یہی وہ مجبوریاں ہیں جن کے باعث ہم کو چونسٹھ سے چالیس صفحے پہ اترنا پڑا۔

جب پہلی مرتبہ ہم نے ایک جز کی حد تک کمی کا اعلان کیا تو ہندستانی ادب کے بہت سے کرم فرماوں نے ہمیں اس خصوص میں توجہ دلائی کہ مضامین اور نظموں کی تعداد میں زیادہ کمی ہو گئی ہے ان کا یہ اعتراض واجبیت پر مبنی تھا۔ لیکن ہم بھی بڑی حد تک حق بجانب تھے اور اس وقت ہم نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اگر آنے والے حالات ہمارا ساتھ نہ دیں تو ہم اور بھی کمی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے چنانچہ ہمارا وہ شبہ آخرکار صحیح ہو کر نکلا اور پچھلے مہینے میں ہم نے اور آٹھ صفحوں کی کمی کر دی اس کے ساتھ ساتھ اپنی وہ تمام مجبوریاں بھی ظاہر کر دیں جن کے سبب صفحے گھٹانے پڑے اس کے بعد ہی ہمارے ہاں شکایتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ اور آٹھ صفحوں کی کمی پڑھنے والوں کے لیے ناقابل برداشت ہے ہم ان واجبی شکایتوں پر ٹھنڈے دل سے مہینے کے آخر تک غور کرتے رہے لیکن اس سوچ بچار کے بعد بھی کوئی مفید حل تلاش نہ کیا جا سکا ہم اپنے کرم فرماوں پر اس امر کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مختصر سی ضخامت کے باوجود یہ پرچہ اپنے پاوں پر آپ کھڑے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر تھوڑی بہت گنجائش بھی نکل آتی تو یقیناً ہم ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کی فرمائش کی تکمیل کر دیتے ان حالات میں پرچے کا نکلنا ہی بجائے خود ایک معجزہ ہے اور ہمیں آیندہ کے لیے یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ جیسا مجلس نگرانی قیمت اشیا نے کاغذ کی موجودہ قیمت میں اور اضافہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اگر اس کی یہ اسکیم عملی صورت اختیار کر لے تو لازمی طور پر کاغذ کا بھاو اور بھی بڑھ جائے گا ایسی صورت میں شاید ہندستانی ادب کو میٹھی نیند کے مزے لینے پڑیں بہرحال ہندستانی ادب کی کشتی مصائب کے بھنور میں پھنس چکی ہے نہ معلوم آیندہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ ان حالات کے مدنظر ہم حجم کی کمی سے متعلق اپنے مہربان پڑھنے والوں سے معافی چاہتے ہیں۔

عالمگیر اتحاد

تاریخ عالم کا کوئی ایسا دور نہیں گذرا جس میں دنیا کو قومی، نسلی، لسانی اور معاشرتی جتھا بندیوں سے نکالکر ایک عالمگیر بھائی چارے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک قوم کی عالمی برتری کا میلان بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ نسلی اور قومی امتیازات کا بول بالا رہا ہے۔ ابتدا چونکہ ملوکیت کا دور دورہ تھا اس لیے سیاسی مدبرین کے نزدیک اس عالمی اتحاد کی یہی بہتر صورت تھی کہ دنیا کو فتح کر کے ایک مملکت بنا دیا جائے یا کم از کم ایک مملکت کی برتری باقی ساری مملکتوں سے تسلیم کرائی جائے تاریخ شاہد ہے کہ اس کوشش میں کامیابی تقریباً ناممکن ہے۔ ایک ایسے بلند تر انسانی اتحاد کی ضرورت جس میں اقوام محض ارکان اور اعضا کی حیثیت سے شریک ہوں قبل مسیح دور میں محسوس کی گئی۔ اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ وسائل آمد و رفت اور رسل و رسائل میں ترقی ہوتی گئی اس خیال کو استحکام حاصل ہوتا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جرمنی کے ماہرین سیاسیات کا خیال تھا کہ "انسانی سیاست تمام ہی نوع انسان کو ایک نظام میں لانے کی کوشش سے باز نہیں رہ سکتی"۔ لیکن تاریخی حقائق کے مطالعے نے ان کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ "یہ سچ ہے کہ ازمنہ تاریخی میں عالمگیر سلطنت کے حصول کی تمام کوششیں آخر میں ناکام ہوئیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ مقصد ناقابل حصول ہے" ان بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جرمنی سے ایک با جروت اور [illegible] عالمی مملکت کے قیام کی جد و جہد کے آغاز سے کتنا قبل اس خیال کو دماغوں میں نشو و نما دیا جا رہا تھا۔ جرمنی کے مجوزہ عالمی اتحاد کا ذکر تاریخی اعتبار سے آگے آتا ہے۔

سب سے پہلے جس باہمت نے ایک عالمگیر اتحاد کے قیام کی کوشش کی وہ سکندر یونانی تھا۔ مقدونیہ کی ایک چھوٹی سی مملکت کا یہ وارث اپنا مقصد مشرق و مغرب کا اتحاد و اختلاط قرار دیکر یونانی بہادر سپاہیوں اور مستقل مزاج سرداروں کی دلجوئی کرتا۔ ان پر زر و مال و دولت نچھاور کرتا دریائے سندھ تک آتا ہے۔ یہاں پر کسی قسم کی تحریص و ترغیب اس کے سپاہیوں کو آگے بڑھنے پر آمادہ نہیں کرتی اور بادل ناخواستہ اپنی ساری امنگوں اور آرزوں کو لیا ہوا یہ نوجوان فاتح دل شکستہ یونان کا رخ کرتا ہے لیکن اب جب کہ اس کی امیدوں کا جنازہ نکل چکا تھا اجل اس کو آ دبوچتی ہے۔ اور تاریخ کی یہ پہلی عالمگیر اتحاد کی کوشش جسمیں ایک فاتح سب کچھ تھا۔ اس طرح نامکمل اور ادھوری ختم ہوتی ہے۔ سکندر کا مرنا تھا کہ وہ ساری مملکتیں جو قوت کے زیر اثر ایک زنجیر میں منسلک ہوئی تھیں پھر بکھر جاتی ہیں اور یورپ و ایشیا میں مختلف چھوٹی بڑی مملکتیں از سر نو نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک فطری سبب تو یہ تھا کہ انسان میں اتحاد سے زیادہ علیحدگی کا جذبہ ہے۔ دوسرا یہ کہ یورپ و ایشیا میں مملکت کا تخیل بالکل متضاد رہا ہے۔ یونانی مملکت کو ایک انسانی ادارہ تصور کرتے تھے۔ لیکن ایرانیوں کے نزدیک یہ اس سے کہیں بلند تر چیز تھی جس کو مذہب اور عقیدے سے گہرا تعلق تھا۔

روما کے باشندے ایک عجیب قسم کے اعتقاد کے

حامل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رومی ساری قوموں کو زیرِ اقتدار لانے اور ان پر حکومت کرنے پیدا ہوئے ہیں۔ جرمنی کا موجودہ طرزِ عمل اس کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ سکندر کا تجربہ رومیوں کے سامنے تھا۔ سکندر نے مفتوح اقوام کو یونانی نہیں بنایا تھا اس لیے رومی یہ خیال کیے کہ اگر ساری دنیا کو رومی بنا دیا جائے تو مختلف اقوام کے مختلف متضاد اعتقادات و تخیلات باقی نہ رہیں گے اور اس طرح جو اتحاد و یگانگت پیدا ہوگی وہ زیادہ دیرپا اور مستقل ہوگی۔ یہی راستہ دراصل ان کی ناکامی کا اہم سبب تھا۔ ساری دنیا کو کسی ایک اعتقاد کے تحت لانا انسانی قوت سے دور ہے۔ اس لیے رومن اور ٹیوٹن قوتوں کے درمیان تصادم ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ٹیوٹن قوم رومیوں پر غالب آگئی۔ اس طرح یہ دوسری کوشش غیر مسعود ثابت ہوئی۔

اس ناکامی کا ردِ عمل یہ ہوا کہ سیاست اور مذہب یا معتقدات کو دو جداگانہ چیزیں قرار دیا گیا۔ اب سیاسی مدبرین یہ کہنے لگے کہ مملکت کو اس کے افراد کے مذہبی اعتقادات سے کوئی سروکار نہیں۔ مذہبی مبلغین اور مصلحین مذہب کا پرچار کریں لیکن سیاست میں دخل نہ دیں۔ اور اس طرح سیاست مذہب سے علحدہ رہیں۔ اس طرح اب انسان کی دو حیثیتیں قرار دی گئیں ایک تو بحیثیت رکنِ مملکت کے اور دوسرے مذہبی معتقدات کے۔ یہ مذہب عیسوی کا ابتدائی دور تھا۔ عیسوی عالمگیر سلطنت کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ مختلف قوموں کو ایک کر دے بلکہ اس کا مقصد یہ تبلایا گیا کہ ان سب مختلف اقوام کو امن و انصاف کا اطمینان دلائے۔ چونکہ مملکت کا مقصد اعلا عدل و انصاف ہے اس لیے رومن شہنشاہ ایک حاکمِ مطلق انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ بلکہ اس کو مختلف زیرِ نگیں اقوام کے حقوق اور ان کی آزادی کے ایک عادل محافظ کا بہروپ دیا گیا۔ ازمنہ وسطا کی شہنشاہی کے متعلق آج یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقی آزاد سلطنتوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھی اور یہ سب کے سب

ایک عالم نظم کی غرض سے متحد تھے۔ لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ انسان میں اتحاد سے زیادہ افتراق کا میلان ہے۔ قوموں اور زبانوں کے قوانین نے جس کو اس شہنشاہی نے بظاہر برقرار رکھا تھا دراصل اس کو کھوکھلا بنا دیا تھا۔ اس بنا پر فرانس اور جرمنی کا اتحاد باقی نہ رہ سکا۔ فرنگ کی وسیع سلطنت ٹکڑے ہوگئی۔ رومن شہنشاہ ماتحت آزاد امرا سے بھی کمزور ہوگیا۔ مرکزی تنظیم جیسے ہی کمزور ہوگئی اجزا نے قوت پیدا کر کے علحدگی اختیار کرلی اور رومی شہنشاہی کی دھجیاں اڑ گئیں۔ درحقیقت اس ظاہری پردے کے اندر رومی مذہب کا بھی کھیل کھیل رہے تھے۔ لیاس کامیابی کے جلو میں مذہبی تبلیغ بھی کی جاتی رہی۔ اور رفتہ رفتہ سیاست پر مغرب کا رنگ چڑھنے لگا جس کا آئینہ دار پاپائیت کا اقتدار تھا۔

نپولین نے پھر ایک مرتبہ اس کوشش کو کامیاب انجام تک پہنچانے کی ٹھانی۔ رومی اس کو ایک سبق دے رہے تھے کہ جب تک مرکزی تنظیم بہت زیادہ طاقتور نہ ہو اجزا مرکز سے وابستہ نہیں رہ سکتے اس لیے اس نے مرکز کے لیے ایک عظیم الشان فوجی قوت پیدا کرلی اور اس کے اطراف ایک عالمی مملکت کا خاکہ بنالیا۔ لیکن پھر بھی اس خاکے میں اجزا کو تھوڑی بہت آزادی دے رکھی تھی اور جس کی بدولت رومیوں کو نقصان ہوئی تھی اس کا منتہائے مقصد یہ تھا کہ یورپ ایک بین الاقوامی سلطنت کے تحت آجائے جس میں متعدد مملکتیں اعضا و ارکان کی حیثیت رکھتے ہوں لیکن مرکز میں اقتدار فرانسیسی قوم کو حاصل ہو۔ جرمنی کو تو وہ کسی طرح زیر کر ہی لیا اور اپنی فوقیت او برتری قایم کردی لیکن اس وقت انگریز قوم بیدار ہوچکی تھی اس نے اس کا مقابلہ کیا اور نپولین کے مقاصد کا یہ جہاز انگریزی ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ اب انگریزی اسی ڈھانچے پر اپنا جہاز تعمیر کر کے اس کو آگے بڑھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ نپولین اس مرکزی تنظیم میں فرانس کو افضلیت دینا چاہتا تھا اور اب انگریز یہ مقام اپنے لیے حاصل کرنا چاہتے

انگریزوں کی بلند ہمت یہ امید کرنے لگی کہ اگرچہ کہ ایک عالمی اتحاد کی ساری کوششیں ناکام رہیں لیکن صنعتی انقلاب کی وجہ سے ان کی امیدیں بندھی ہوئی تھیں۔ جدید تحقیقاتوں اور ایجادوں کی بدولت جو عام انقلاب پیدا ہو رہا تھا مختلف دور افتادہ مملکتوں اور قوموں کے درمیان ہم آہنگی اور ربط پیدا کر رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے اب بجائے راست سیاسی کارروائیوں کے معاشی تخیل کے ذریعے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہا تاکہ دنیا کے مختلف ممالک اپنے معاشی اغراض کے تحت ایک دوسرے سے ملے رہیں۔ صنعتی انقلاب اور اس کے دوران کے معاشی نظریے بڑی حد تک ان کی مدد کرتے رہے۔ انہوں نے ایک خاص نظریے "عالمی تقسیم عمل" کے ذریعے ساری دنیا کی دماغی تربیت کرنی چاہی تاکہ معاشی اغراض کے لیے ایک قوم کو دوسری کا اور ایک ملک کو دوسرے ملک کا محتاج بنا دیا جائے اور پھر آسانی سے ان پر معاشی تسلط حاصل کرکے سیاسی برتری حاصل کر لی جائے۔ اس غرض سے غیر ترقی یافتہ ممالک کی حد تک معاشی استحصال کو آلۂ کار بنانا آسان چیز تھی۔ مگر جنگ عظیم نے اس خوش کن نظریہ عالمی تقسیم عمل کے پرخچے اڑا دیے اور خود یورپ میں ایک سے زیادہ قومیں ایسی نمودار ہوئیں جو دنیا میں معاشی برتری کے حصول میں انگریزوں کی رقیب کہلائی جاتی تھیں۔ اس لیے اب انگریزوں نے ایک دوسرا نہایت ہی دلاویز نظریہ پیش کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ عالمگیر کا مقصد منفرد مملکتوں اور قوموں کو دبا لینا یا مطیع کر لینا نہیں بلکہ مملکتوں کے لیے امن اور قوموں کے لیے آزادی کے حصول و تحفظ کا بہتر بندوبست کرنا تھا۔ اسی مقام پر قومی مملکتوں کی غرض و غایت کی بھی وضاحت کی گئی جو عالمی اتحاد میں اس لیے سنگ راہ بنی ہوئی تھیں کہ اس وقت تک قومی مملکت کا مقصد قوم کی برتری کا قیام، تحفظ اور بحیثیت مجموعی قومی دولت میں اضافہ تھا اس لیے اب قومی منفرد مملکتوں کے اختیار میں یہ تحدید کر دی گئی کہ وہ صرف ان امور میں مداخلت کریں جو مشترک مفاد اور اجتماعی اغراض کے لیے ضروری ہوں یہیں سے انسان کی دو حیثیتیں قرار دی گئیں ایک انفرادی اور دوسرے اجتماعی۔ افراد کی انفرادی زندگی میں مملکت الوقت مداخلت کرنے سے باز رہتی جب تک کہ اجتماعی مفاد اس کا متقاضی نہ ہوتا۔ یہیں سے مملکتوں کے لیے عدم مداخلت کی راہ تجویز کی گئی اور اسی کے ساتھ آزاد تجارت کے تخیل نے جنم لیا۔

لیکن جنگ عظیم کے دوران میں یہ نظریے اپنی اہمیت کھو بیٹھے عموماً ہر جنگ کے بعد اس کے ردعمل کے طور پر امن و اماں کی خواہش رہی ہے۔ اور مفتوحہ علاقوں میں فاتح سے نفرت کے ساتھ ساتھ قومی جذبات ترقی پاتے ہیں۔ فاتح اس بات کے کوشاں رہتے ہیں کہ دنیا ایک بین قومی ادارے کے تحت امن و چین کی زندگی بسر کرے اور آپس کے تنازعات ثالثی کے ذریعے طے پائیں اور بظاہر ہر جگہ عدل و مساوات کا اصول کارفرما ہو لیکن مفتوحہ ممالک اپنے پہلے اقتدار کو حاصل کرنے سے باز نہیں رہتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بین الاقوامی جذبات کو زک پہنچتی ہے۔ یہی حال جنگ عظیم کے بعد میں جس کے دوران میں بین الاقوامی تخیل ختم ہو چکا تھا لیکن جوں ہی جنگ ختم ہوئی بین الاقوامی رجحانات عیاں ہونے لگے برطانوی مدبرین سیاست اب بجائے کسی اصول کی پابندی کے محض مصلحت وقت کے پابند ہو گئے جن سے مقصد یہ تھا کہ ممکنہ حد تک تصادم کو روکا جائے جو ملک برطانوی اقتدار کے تحت ان کے لیے یہ طے پایا کہ مناسب موقعوں پر ان کو آزادی دیدی جائے اور برطانوی دولت اقوام کا رکن بنا لیا جائے۔ تاکہ کم از کم برطانوی مقبوضہ علاقوں میں مسلسل اشتراک و اتحاد قائم رہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے جنگ عظیم سے قبل برطانوی علمائے معاشیات و سیاسیات عدم مداخلت عالمی تقسیم عمل اور آزاد تجارت کے موئید تھے۔ اور اسی میں ان کا فائدہ بھی تھا لیکن جنگ عظیم کے بعد اس کا ردعمل شروع ہوا معاشی ناکہ بندی کے تلخ تجربے نے مختلف ممالک کو خود کفالت کی پالیسی کا

موئید بنا دیا جو بالکل عالمگیر اتحاد کے منافی ہے۔ مملکت کی جدوجہد
کا اب مقصد یہ قرار پایا کہ وہ ملک کو خود کفیل و تنہا حملہ آور سے
مدافعت کا اہل بنائے اور اس غرض کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار
کیجائیں۔ اس دماغی تربیت اور انقلاب کے باوجود اکثر حصۂ دنیا
پر برطانیہ کو برتری حاصل رہی۔ اور اس کا تحفظ انگریزوں کے
نزدیک ضروری تھا اور پھر معاشی حالات اور تخیلات و نیز
تعلقات میں اس قسم کی یکایک تبدیلی ناممکن تھی۔ اور خود کفیلی
کو حاصل کرنے تک ہر ملک کے باہمی تعلقات کا قائم رہنا
ضروری تھا۔ یہ تعلقات یکدم منقطع نہیں ہو سکتے تھے بلکہ تدریجاً
ان میں کمی ہو سکتی تھی۔ جب اکثر غیر برطانوی ممالک اس پالیسی پر
عمل کرنے لگے تو ساری دنیا میں ایک قسم کی کشمکش شروع ہو گئی
جس کی مختلف شکلیں دنیا کی موجودہ سیاسی تحریکات ہیں۔ ان
تمام حالات کے باوجود برطانیہ عالمگیر اتحاد سے بالکل مایوس
نہ تھا۔ جنگ عظیم کے فاتحوں کا پیدا کردہ ادارہ مجلس اقوام
بعض موقعوں پر ثالثی کرانے میں کامیاب [illegible] رہا۔

مجلس اقوام اور اس کا دستور و نیز اس کے قواعد و قانون
اس راہ کے آئینہ دار ہیں۔ جس پر جنگ عظیم کے فاتح ایک عالمگیر
اتحاد اور بھائی چارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مجلس اقوام کے بین اقوامی
اصول اور قواعد کو اکثر علمائے سیاسیات قانون ماننے تیار
نہیں ہیں۔ کیونکہ قانون تو وہ ہے جس کی تعمیل میں رضا و رغبت
کا کوئی سوال نہیں ہوتا بلکہ اس کی تعمیل جبر سے کرائی جاتی ہے۔
بین قومی قواعد کے پیچھے ایسی کوئی قوت نہ تھی۔ اور پھر اعلیٰ
عدالت کے فیصلوں کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار
فریقین کو تھا۔ اور پھر اراکین مجلس اقوام کے نزدیک مجلس کی
کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ جب کبھی قومی یا ملکی مفاد اور بین قومی
قواعد میں تصادم کا موقع آتا تو ہر رکن مملکت کچھ پس و پیش کے
بعد وہی راہ اختیار کرتا جو اس کے اپنے فائدے کی ہوتی
خواہ اس سے بین قومی مفاد کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔ ہر وہ
مملکت جو متمدن ہونے کے ساتھ ساتھ قوت کی بھی مالک ہے
اس بات کو ہرگز گوارا نہ کرتی کہ کوئی ادارہ اس کے اپنے معاملات
میں مداخلت کرے۔ البتہ کم قوت مملکتیں ان قواعد سے کچھ ڈری
سہمی ضرور رہتی تھیں۔ لیکن طاقتور مملکتیں پہلے تو اس بات کی سعی کرتیں
تھیں کہ بین اقوامی قواعد ممکنہ حد تک ان کے ممد و معاون ہوں
تاکہ وہ بظاہر کسی اخلاقی خلاف ورزی کے مرتکب خیال نہ کیے جائیں
لیکن جب بین قومی قواعد ان کی منشا کے خلاف ہوتے تو یہ سرے
سے ان کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے۔ سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۳۰ء
تک مجلس اقوام نے بعض جھگڑے چکائے لیکن سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد
سے اس کی اہمیت ایک دم صفر ہو گئی۔ اس میں بالشویک تحریک
اور جرمنی اور اٹلی میں قومی تنظیم زور پکڑتی ہے۔ ہٹلر اور مسولینی اس
مقصد سے اٹھتے ہیں جرمنی اور اٹلی کو طاقتور بنایا جائے اور کسی
دوسرے ملک کے مفاد یا کسی عہد نامے کی پروا نہ کیجائے اگر وہ
اس مقصد کے حصول میں سنگ راہ ثابت ہوں۔ یہ طریقۂ کار
قومی اعتبار سے چاہے کتنا ہی سراہا جائے بین قومی نقطۂ نظر سے
قابل تعریف ہے۔ اس اصول پر جب ہٹلر اور مسولینی کی حکومتوں
نے عمل کیا تو مجلس اقوام ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ جاپان چین کے منچوری
علاقوں پر قابض ہو گیا لیکن مجلس اقوام کوئی موثر رکاوٹ پیش
نہ کر سکی۔ ہٹلر کا مطمح نظر ہی جرمنی کو طاقتور بنانا تھا اس لیے جب
اس کی جنگی تیاری اور اسلحہ سازی کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے
لگیں تو اس نے یہ کہہ کر علیحدگی اختیار کر لی کہ تخفیف اسلحہ ساری
مملکتوں کے لیے ہونا چاہیے۔ مجلس اقوام منہ دیکھتی رہ گئی۔ مسولینی حبشہ
پر کھلے بندوں ظلم توڑ کر قابض ہوا اور مجلس اقوام مباحثوں میں ہی
مصروف رہی۔

اس طرح سے یہ بے قوت ادارہ جس کو فیصلہ کرنے کا
تو اختیار تھا لیکن اس کا منوانا اس کے بس کی بات نہ تھی آخر کار بے
موت مر گیا۔ اس کے دو اہم سبب تھے اول تو یہ کہ مجلس اقوام
کی عدالت ثالثی کے فیصلے بالکل غیر جانب داری کے ساتھ اور عدل
و مساوات کے اصول پر ہوتے تھے کہنا بے جا ہے۔ کیونکہ یہ
فیصلہ کرنے والے افراد تھے جن کا تعلق کسی نہ کسی چھوٹی بڑی مملکت سے

مزدور تھا جو کسی طرح پاس، خاطر، مروت اور خوف سے آزاد نہیں کیے جاسکے۔ دوسرے یہ کہ سب جانتے تھے کہ مجلس اقوام بے اقتدار ادارہ ہے۔ اس لیے جب کبھی اس کے اصول کی خلاف ورزی ہوتی تو ہر دو فریق عدالت میں پیروی و جوابدہی کرتے یہاں تک کہ اصول توڑنے والی قوت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی اور جب فیصلہ ہو جاتا تو عملاً اس کے قبول کرنے کا دار و مدار فریقین کی رضامندی پر تھا۔

جس طرح رومی اور فرانسیسی اقوام نے عالمگیر اتحاد کو بزور شمشیر قایم کرنا چاہا تھا اور جس میں اپنی اپنی قوم کو باقی ساری قوموں سے متمدن، افضل اور برتر قرار دے لیا تھا۔ اسی طرح سے جنگ عظیم کے کچھ ہی دنوں بعد جرمنی سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ عالمگیر اتحاد جرمن قوم کی برتری میں قایم ہونا چاہیے جو ساری نسلوں اور قوموں سے زیادہ متمدن، مہذب، ممتاز اور برترین ہے اس لیے ایک ایسی عالمگیر تنظیم ہونی چاہیے جس میں ساری مملکتیں اور اقوام محض اعضائے جسم کی حیثیت سے شامل ہوں اور اس تنظیم کا مرکز یا محور جرمن قوم ہو۔ جس طرح جملہ اعضائے انسانی پیٹ کے لئے کام کرتے ہیں اور سارے انسانی اعضا کی قوت کا دار و مدار پیٹ پر ہے۔ اسی طرح اس مجوزہ عالمگیر اتحاد میں ساری مملکتیں جرمنی کے لیے ہوں۔ جرمنی ہی ان کا مرکز اقتدار ہو جس سے وہ قوت حاصل کریں اور بحیثیت مجموعی وہ جرمنی کے لیے زندہ رہیں۔ اس طرح سے پھر ایک بار دنیا میں باقتدار عالمگیر مملکت کی جد و جہد شروع ہوتی ہے۔ جو تاریخ میں اس سے پہلے کئی بار ناکام ہو چکی ہے۔

اس طرح سے عالمگیر اتحاد کی ساری جد و جہد نتیجے کے اعتبار سے قطعی ناکام ثابت ہوئی ہے۔ یہ جد و جہد دو متضاد راہوں پر ہوئی اور دونوں میں ناکام ہوئی ایک جد و جہد کا مقصد تو باقتدار اور طاقتور مرکزی تنظیم تھا اور دوسری کا مقصد بے اقتدار رضاکارانہ اور محض اخلاقی اتحاد تھا۔ یہ دونوں ناکام ہوئے۔ اور بظاہر کوئی تیسری شکل دکھائی نہیں دیتی اور سیاسی ونیز معاشی اصول پر عالمگیر اتحاد تقریباً ناممکن ہے۔ البتہ مذہبی طور پر اس کا حصول غیر ممکن نہیں دکھائی دیتا۔ دنیا کے کسی مذہب میں باقی دوسرے مذاہب کے لیے کوئی جگہ نہیں سوائے مذہب اسلام کے۔ اسلام کی بنیاد ہی عالمگیر اتحاد پر رکھی گئی ہے۔ جس کی بنیاد نہ تو مذہبی مفاد ہے اور نہ سیاسی و معاشی مفاد ہے بلکہ بنی نوع انسان کے درمیان … یگانگت اور باہمی اخوت ہے۔ تاریخ اسلام ایک عالمگیر اتحاد کی تاریخ ہے۔ یہ کہنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ مذہب اسلام بھی اس کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کا سبب احکام الٰہی کی غلط تاویل اور علمائے مذاہب کی غلط رہبری و تنگ نظری ہے اگر اسلامی قوانین کو پھر ایک بار خالص بنایا جائے تو یقین ہے کہ وہ عالمگیر اتحاد کی راہ میں مشعل کا کام دیں۔

انوار احمد (عثمانیہ)

سلام

(اسکی مختلف ادائیں اور اقسام)

دنیا میں میل جول کا شیوہ سلام ہے
غیروں کو اپنا کرنے کا نسخہ سلام ہے

مذہب ہر ایک وسیلہ ہے حکم سلام عام
انسانیت کا جامہ زیبا سلام ہے

ہر شے کی قسمیں ہوتی ہیں جسطرح کچھ نہ کچھ
یونہی ہزاروں قسم کا اپنا سلام ہے

(نام)

آداب۔ مجرا۔ بندگی۔ تسلیم و کورنش
اور "صبح خیر" بھی از انجملہ سلام ہے

تعظیم۔ جبہ سائی۔ قدم۔ ہاتھ چومنا
مونڈی کا پیٹ میں بھی جھکانا سلام ہے

بلہار جانا۔ صدقے۔ فدا ہونا پیار سے
یا کوئی اک دعا کا سنانا سلام ہے

بوقت صبح "صبحک اللہ بالسرور"
اور "مساک اللہ" شام میں کہنا سلام ہے

پرنام و ڈنڈوت و نمسکار و رام رام
کہنا نمستے۔ ہاتھ اٹھانا سلام ہے

جے رام جی کی۔ ڈنڈم و سیرن بھی ہیں سلام
ہاتھوں کو دونوں جوڑ بھی لینا سلام ہے

گڈ مارننگ و گڈ ڈے و گڈ نون و آفٹر نون
"گڈ نائٹ ڈارلنگ" بھی کہنا سلام ہے

(اقسام)

بعضے سلام ماتحتی۔ بعض افسری
رسمی ہے کوئی۔ کوئی غرض کا سلام ہے

رہ کر مکان پر کبھی کہنا "نہیں ہیں صاحب"
یہ شان عہدہ داری کا آدنا سلام ہے

دفتر میں وقت ملنے کا لکھ کر لگا کے بھی
"فرصت نہیں ہے" کہہ کے بڑھانا سلام ہے

انجان ہونا اہل غرض کے سلام پر
اغماض کر کے شان دکھانا سلام ہے

تقریب مذہبی کا کبھی برقعہ اوڑھ کر
جا جا کے عطر پان اڑانا سلام ہے

کرنا سلام منع جہاں ہے۔ وہاں ضرور
کر کے سلام شور مچانا سلام ہے

زعم انانیت میں کبھی طالب سلام
بچ کر کبھی سلام سے جانا سلام ہے

(ادائیں)

اک وہ سلام ہاتھ ہلا کر جو ہو ادا
قدموں تک ایک۔ سر کو جھکانا سلام ہے

تیوری کے بل سے ایک ادا ہوتا ہے سلام
اک سر کو جھٹکا دے کے ہلانا سلام ہے

وہ بھی سلام ہے جو فقط دیکھیں اک نظر
یا منہ کو قدرے ٹیڑھا بنانا سلام ہے

آنا کسی کو دیکھ کھڑا ہونا ہے سلام
ٹوپی کو سر سے ہاتھ میں لینا سلام ہے

آنکھیں نکالنا بھی کبھی ہے سلام ہی
گاہے اک آدھ دانت دکھانا سلام ہے

سر در گریباں ہونا بھی قسم سلام ہے
منہ اپنا گاہے موڑ بھی لینا سلام ہے

مٹی پلید ایسی غرض ہے سلام کی
ہر عیب کو کمال بنانا سلام ہے

ہونے لگا سلام ہے اب ٹھوکروں سے حیف
احمد۔ بس اس سلام کو اپنا سلام ہے

احمد (حیدرآباد)

ناکام محبت

انیس مردانہ حسن کی مکمل تصویر تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی، ستوان ناک، سرخ و سپید رنگت، کتابی چہرہ، فراخ سینہ، ہلکا تبسم۔ خوبصورت آنکھوں کی نیلی پتلیوں میں طوفان زدہ سمندر کے ٹھیرے ہوئے پانی کا سکون کسی غیر معمولی استقلال کی جھلک کا حامل تھا ان اوصاف سے متصف ہونے کے بعد باوجود اس کا بے لوث "کیرکٹر" اعلیٰ درجے کا ادبی مذاق پاکیزہ خیالات، اور شریفانہ ماحول لائق ستائش اور قابل توصیف محاسن تھے۔

انیس متمول تھا اور متاہل بھی۔ شمسہ جیسی حسین و جمیل "مریم صفت" اور عصمت مآب رفیقہ حیات، اس کی زندگی کے خلا کو پر کیے ہوئے تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی نہایت ہی خوشگوار تھی۔ انیس و شمسہ کے لیے ایک دوسرے کا وجود بہت سی خصوصیات کا حامل تھا۔ وہ ایک دوسرے کی پرستش کرتے تھے، یونہی نہیں۔ بلکہ کسی غیبی اور سماوی جذبے کے تحت بسا اوقات انیس کی حد سے بڑھی ہوئی شیفتگی شمسہ کو خوفزدہ کر دیتی۔ وہ خائف ہو جاتی اپنی محبت کو کامیاب دیکھ کر۔ اس کا دل پہلو میں زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ اور وہ پکار اٹھتی اے عشق! تجھے اپنی شان تبریک کی قسم مجھے ہمت دے۔ معبود جانے۔ انیس چند روز سے کیوں اداس نظر آتا ہے۔ غم کی ایک ہلکی سی لہر اس کے دل و دماغ کے سکون کو برہم کر دیتی۔ وہ اپنے خیالات میں پراگندگی جذبات میں آشفتگی، اور روح میں خلفشار محسوس کرتا۔ شاید اس لیے کہ انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ آرزوئیں ہمیشہ تشنہ تکمیل رہیں۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کی قوت متفکرہ سلب اور سکون قلب رخصت ہو چکا۔ چند خاموش چنگاریوں سے شعلہ ریز ہو کر مجمر قلب میں ایک آتش ملتہب روشن کر دی۔ انیس نے اپنی بے پایاں تنہائی سے اکتا کر نہانے کا راستہ لیا۔ حسین شمسہ کو منتظر پا کر اس کی کوفت میں بہت حد تک کمی ہو گئی۔

آپ آ گئے۔ شمسہ نے مسرور ہو کر کہا۔

ہاں! انیس نے جواب دیا۔

تم آزردہ ہو انیس شمسہ نے اداس ہو کر پوچھا۔

نہیں شمسہ محض تمہارا خیال ہے۔ آؤ چاندنی پر بیٹھیں۔

دونوں نے بالاخانے کی راہ لی۔ ---- موسم دلفریب تھا۔ ہوا کے خنک جھونکے چنبیلی کی نرم و نازک پتیوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ گملوں میں لگے ہوئے پودے سرگوشیوں میں محو تھے۔ سرسبز لچکدار ٹہنیاں باہمدگر مصروف معانقہ تھیں۔ اور ---- عشق پیچاں کی حسین و شاداب بیل مصنوعی ستون کے سہارے کی متلاشی تھی۔

"شمسہ! مجھے کل جانا ہے" انیس نے آہستہ سے کہا

"کیا گاؤں کو؟" شمسہ نے استفسار کیا۔

"ہاں!" نمبردار کی طویل علالت نے بہت بدنظمی پیدا کر رکھی ہے۔ ضروری ہے کہ وہاں میں خود جاؤں اور چند روز رہ کر قابل تصفیہ امور کا فیصلہ کرا دوں"۔

جلدی لوٹنا انیس! جدائی کے خیال سے متاثر شمسہ نے کہا۔

(۲)

علی الصباح ہی انیس نے گھوڑے پر سوار ہو کر گاؤں کا راستہ لیا۔ ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے۔ سرسبز و

شاداب کھیتیاں، پھولی ہوئی سرسوں۔ ندی کا بہتا ہوا پانی۔
ہری ہری گھاس کے فرش مخملیں پر، مویشیوں کے ریوڑ ——
چھوٹے چرواہے کا منڈھیر پر بیٹھ کر الاپنا "ساون آیا تم نہ
آئے"۔ غرض کہ قدرت کا ہر جاذب نظر اور دلفریب منظر
انیس کو اپنی جانب متوجہ کیے ہوئے تھا —— وہ انہیں الفت
آگیں خیالات سے مخمور۔ ان روح پرور و مسرت انگیز
دلچسپیوں سے مسحور چلا جا رہا تھا۔ ایک عالم نیم مدہوشی میں۔
کسی سرمدی کیف، اور ابدی لذت سے ہمکنار —— ایک ناقابل
فراموش احساس اور کسی لاتناہی جذبے سے معمور —— جو کہ
اس کے دل و دماغ کی بلندیوں اور پہنائیوں پر چھایا ہوا
تھا۔ اور جس نے، اس کی روح کے تمام نشیب و فراز کو ہموار
کر رکھا تھا۔

سواد گاؤں میں داخل ہوتے ہی متعدد دیہاتی
شرفا انیس کے استقبال کو بڑھے۔ اس نے اپنا رہوار ملازم
کے سپرد کیا —— اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے دیہی مکان
میں فروکش ہو، اسے یہی مناسب معلوم ہوا کہ وہ نمبردار کی
عیادت کو چلے۔

(۳)

انیس کو گاؤں میں آئے ہوئے آج کئی روز ہو گئے
مگر ان کی بڑھتی ہوئی مصروفیتیں، سیر و تفریح کی راہ میں،
سد سکندری بن کر حائل رہیں —— آج کئی روز کے
بعد وہ تنہا نظر آتا ہے۔ چہرے پر شگفتگی کے آثار ہویدا ہیں
اک نا زیر لب گا، "آج تو سیر کا دن ہے۔ کہیں چلنا چاہیے"
اپنے دل سے یہ تصفیہ کرتے ہی انیس نے کھیتوں کی راہ لی
اس کا بڑھا ہوا شوق قدرت کے حسین مناظر کی کشش اسے
دور لے گئی۔ بہت دور وہ چلتا رہا۔ ندی کے کنارے کنارے
کھیتوں کے لاتناہی سلسلے کے ساتھ ساتھ۔ ایک دوسرے
سے مل مل کر علیحدہ ہو جانے والی پگڈنڈیوں کی معیت
میں —— ایک آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ
منقطع کر دیا —— کسی کی مترنم آواز —— "بالم آئیو بسو
مورے من میں" —— وہ بے چین ہو گیا —— چشم زدن
میں انیس کی متلاشی نگاہوں نے کھیت کے کنارے کسی کو
دیکھ لیا۔ کون ہے وہ؟ —— ایک عورت! —— کتنی
سریلی اور دلکش تان ہے؟ —— لو! وہ تو ادھر ہی آ رہی
ہے..... غالباً اس نے تو مجھے دیکھا ہی نہیں ——
کس قدر خوبصورت؟ کیسی بھولی؟ اوہ! کتنی سندر ہے
یہ؟ —— گاؤں کی خود رو پیداوار میں کتنا حسین
پھول؟ —— تم کون ہو؟ —— انیس نے دو قدم
آگے بڑھ کر اپنی حیرت و استعجاب پر قابو پانے کی سعی ناکام
کرتے ہوئے سوال کیا —— وہ ٹھٹک گئی —— "میں۔
میں گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہوں۔ اور آپ؟ —— آپ
مالک ہیں؟ لڑکی نے لجاتے ہوئے کہا۔

"شاید" —— انیس نے اپنی گرتی ہوئی آواز کو بلند
کر کے جواب دیا۔ "نہیں جناب! شاید نہیں۔ یقیناً ——
میں نے اس دن اپنے ہاں۔ آپ کو دعوت میں دیکھا تھا"
اس نے رک رک کر کہا۔

تمہارا نام ——؟

مجھے ریحانہ کہتے ہیں۔ —— ایک اجنبی سے اتنی دیر
گفتگو کرنے پر وہ فرط حیا سے محجوب ہو گئی۔ مجھے اب جانا
چاہیے —— وہ زخمی ہرنی کی طرح مڑی —— دیکھتے دیکھتے
ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور انیس ——؟ لرزہ
براندام انیس محو تحیر کھڑا رہ گیا۔ ....

کیوپڈ کے ننھے ننھے پروں کی آواز نے فضا میں ایک ارتعاش
پیدا کر دیا —— ایک سنسناتا ہوا تیر اس کی بے پناہ
کمان سے نکلا، اور نشانے پر جا بیٹھا —— اے دیوتا
تو خوب واقف ہے، اپنے دلنواز تیروں کے برمحل استعمال
سے۔ تیر جگر خراش اور بے چین کن سوزش، دلی تلاطم اور
قلبی ہیجان کا واحد علاج ہے۔ مگر یہ تو بتا! تو کیوں جویا

رستا ہے معصوم دلوں کا؟ —— بول نا! تیری بے نور آنکھوں نے انہیں کو کہاں دیکھا؟ —— کچھ تو سمجھا! تیری کشش غریب ریحانہ کو کھینچ لائی۔؟ اور یہ بھی بتا کہ تو اپنی بیچارن شمہ سے کیوں روٹھ گیا؟ —— آہ تو نے کیا کیا؟ ذرا اندازہ لگا ان کی مجبوریوں کا —— او! حسین دنیں کے جلا دینے ذرا تو سمجھ انہیں کے مغلوب کن جذبات کو —— دیکھ —— محبت کا اتھاہ ساگر اور بیچ و تنہا بے سہارا انیس پرآشوب موجوں کے تباہ کن تھپیڑے گرداب، اور بل کھاتی ہوئی لہریں۔ الفت کا بحر زخار اور انیس کی ڈوبتی ہوئی جیون نیا —— مجسم حزن و یاس —— وقف الم —— گرفتار محشرستان تلاطم، ہنگامہ زار قیامت، کون —— ؟ کیا تو بھول گیا؟ اے کیوپڈ! تیرا حافظہ ہمیشہ سے کمزور ہے

(۴)

انیس، افتاں و خیزاں، واپس ہوا —— دل میں ریحانہ کی مورتی۔ آنکھوں میں شبیہ۔ دماغ میں تصور —— اور لب پر نام —— وہ گھر آیا، اپنے تھکے ہوئے جسم زخمی دل کو سنبھالے ہوئے —— ایک سرد آہ انیس کے خشک اور نا ہمدرد، چسپیدہ لبوں سے نکلی، اور اس کے خروش عشق سے تپیدہ ماحول کو سرد تر کر گئی ——

ریحانہ میں تجھے نہیں بھول سکتا۔ دماغی ارتسامات کا ارتفاع مشکل ہی نہیں قطعی ناممکن۔ او حسین ساحرہ! یہ تو نے کیا ستم کیا؟ شمہ میں تجھے کیا منہ دکھاؤں گا۔ لیکن —— نہیں —— ہاں —— میرا قصور؟ میں نے کیا کیا! —— طالب وصل نہیں طالب دیدار ہوں میں —— دل کے ہاتھوں مجبور ہوں —— دل! —— خوب —— ایک لوتھڑا گوشت ایک قطرہ خون، انیس! تجھے کیا ہو گیا؟ تیرا دل کیوں گھٹ رہا ہے؟ حیات کس لیے تیرہ و تار ہے؟ تجھ سے مایوسیاں کیوں ہو جا رہی ہیں —— امیدیں کس لیے انقطاع چاہتی ہیں؟ کس سے پوچھوں؟ ۔ اچھا ——

میرے شریک اضطراب! —— اے ماہ تاباں! کچھ تو ہی حل کر اس عقدۂ لاینحل کو —— بتا۔ اے پیکر نور بھلا تو کیوں اس قدر زرد ہے؟ تیرا درخشندہ وجود کس لیے ترساں و لرزاں ہے؟ تیرے منور اور ضیا پاش جسم پر میرے سویدائے قلب کے نظیر سیاہ داغ کیوں نمایاں ہیں؟ تو مکمل ہوتے ہی کیوں انحطاط پذیر ہو جاتا ہے۔ کس کے غم میں گھلا کرتا ہے تو؟ —— شمع سحر کی طرح کیوں گھلیل ہوتا رہتا ہے؟ ——

اے بدر منیر! تو نہیں بولتا؟ —— نہ سہی۔ اور اس کی محبوبہ کو مخاطب کریں۔ اے پردیں! اے حسین و جمیل ملکہ! اے چاند کی معشوقہ اور اے ماہ کامل کی ہمدم و دمساز! —— تو ہی کچھ بتا۔ تو ہی بول کہ تو کس لیے نگونسار ہے۔ جلد بتا دے آخر اس لیت و پیش کی وجہ اس تاخیر و تعویق سے کچھ حاصل؟ یہ قابل تہدید و ملامت رویہ کیوں؟ —— نہیں بولے گی تو؟ —— نہ بول میں تجھے مجبور نہیں کروں گا۔ سچ ہے تو بھی تو میری طرح کشتہ الم ہے۔ واثر وئی محبت ناز سا سے فسردہ مضمحل ہے رنجیدہ و کبیدہ خاطر ہے —— نہ آزردہ ہو۔ میری محرم راز! —— اسے (چاند) اس کے حال پہ چھوڑ دے رہنے دے! ہاں رہنے دے۔ نشہ غرور حسن میں سرشار۔ اپنی تابانی و درخشانی سے متاثر!۔ زریں ہے وہ۔ بلندیوں کا مالک —— اور —— اے ستارو یہ تمہیں کیا ہوا؟ —— کیا تم بھی میری طرح بے بس ہو؟ کیوں جلدی آنکھیں جھپکا رہے ہو؟ کیا میری طرح کسی وفا ناآشنا کے انتظار میں تمہاری بھی آنکھیں تھک گئیں ملے تو۔ سحر ہونے لگی۔ ستارو! تم بھی چلدیے؟ ۔ اب میں ہوں اور میرا شکستہ مندر —— مایوس پجاری، اپنی دیوی پر محبت و عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کا منتظر، اور بس ——

(۵)

اس میں شک نہیں، ریحانہ بلا کی حسین تھی۔ قدرت کی فیاضی کا بہترین نمونہ۔ اس کے ملکوتی حسن کا مشاہدہ، کسی مصور کی چشم تصور سے بھی ممکن نہ تھا۔ اعضائے تناسب کے باہم تناسب نے اس کے مرمریں پیکر کو نور کے سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔

ریحانہ اس دن کے بعد کبھی نہیں ہنسی۔ گھر کے کام کاج میں اب اس کا دل نہیں لگتا۔ پہروں تنہا بیٹھی کچھ سوچا کرتی ہے ــــ عورت صنف نازک جب برداشت کرتی ہے، تو اس کا شیشۂ دل، غم والم کی سنگلاخ دیواروں سے ٹکرا کر بھی چکنا چور نہیں ہوتا ــ مگر ــ دامن ضبط وتحمل چھوٹ جانے پر اس کا مائل بہ سکون ہونا قطعی ناممکن ہے۔

ریحانہ کا پیمانہ صبر بھی اب لبریز ہو چکا تھا۔ وہ، شب و روز لوگوں کی چہ میگوئیاں سنتی۔ عشق و مشک چھپائے سے نہیں چھپتے۔ انیس کی ضرورت سے زیادہ آمد و رفت ریحانہ میں دلچسپی، گاؤں کا غیر ضروری قیام ناقابل توجہ فروگذاشتیں نہ تھیں۔ اب وہ مجبور تھی انیس سے ملنے کے لیے۔ ان بڑھتی ہوئی شورشوں کا خاتمہ، کسی نہ کسی ضروری تھا ــــ گاؤں کا جوانسال مالک اور نمبردار کی کمسن بیٹی ــــ ریحانہ بہت دیر اپنی خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھی رہی ــ انیس! تمہیں کیا ہو گیا؟ یہ بات تمہارے مرتبہ کے منافی ہے۔ آہ تم نے تو مجھ غریب کو بھی کہیں کا نہ رکھا۔ ہائے کیا ہو گیا؟ عیش و عشرت کے دن غمگین راتوں میں بدل گئے ــ گونجتے ہوئے قہقہے، سوگوار خاموشیوں میں تبدیل ہو چکے ــ شرفستان مسرت، سیاہ ادائے الم میں چھپ چکا ــ دل کی روشن نگری۔ حسرت و غم کے اندھیروں سے تاریک ہو گئی ــــ

(۶)

انیس کو گاؤں میں رہتے، کئی ماہ گذر چکے۔ ریحانہ سے ملاقات کے بیسیوں مواقع ملے۔ مگر انیس کا جذبۂ محبت تمام ارتقائی منازل طے کر کے اسے اس مقدس فردوس میں لے جا چکا تھا۔ جہاں ریحانہ اور اس کے تصور کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد ریحانہ کی پرستش اور اس کے سوز محبت کی خاموش چنگاریوں میں جل بجھنا ہے وہ محسوس کرتا ــ ایک غم ــ جلن ــ سوزش ــ ہاں! ایک بے پناہ سوز ــــ ایسا سوز، جس کو ریحانہ کے جلووں کی تابش رقیق کر کے سرِ مژگاں پر پہنچا دیتی ــــ اور اکثر ان قطراتِ اشک میں خونِ دل کے سرخ ڈورے، ممزوج نظر آتے۔ ــــ انیس نے بارہا چاہا کہ فراق کے سوگوار دامن میں منہ چھپا کر سو رہے ــــ کاش کہ! وہ اپنی تشنۂ تکمیل تمناؤں کو حسرتِ دل کی خاموش گہرائیوں میں مدفون کر سکتا مگر ــ یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

(۷)

صبح کا سہانا سماں ہے۔ پتے پتے میں جوشِ نمو دار ہے۔ ندی کا شفاف پانی، اپنے ناہموار کناروں سے اٹکھیلیاں کر رہا ہے۔ گاؤں کی عورتیں پانی لے کر جا رہی ہیں۔ سکھیاں ایک دوسری سے خوش فعلیاں کر رہی ہیں ــــ ریحانہ سب سے الگ تھلگ ہے وہ اپنی سانولی سمیں، پانی میں لٹکائے بیٹھی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے شغل کر رہی ہے سینکڑوں ہی ٹھیکریاں اس نے پانی میں پھینک دیں ــــ مگر اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ خود ڈوبنے والی کنکریوں کی مانند کسی کے خیال میں مستغرق ہے؟ ــ وہ دیر تک اسی عالم میں محو رہی۔ ــ کہ ــ کسی کے قدموں کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب منعطف کر لی ــ کون؟ ــ انیس"!

تم ہو؟ ریحانہ! قسمت یاد رہے آج" ــــ انیس نے ہوائے غم و اندوہ سے منتشر اجزائے دل کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

ریحانہ! اتنا تو بتا دو یہ محروم جمال آنکھیں کب تک ہوس دید میں خون کی ندیاں بہایا کریں گی؟ یہ صبر آزما ہجر کب تک

تمہاری آواز کے مشتاق رہیں گے ـــ یہ ہجراں زدہ دماغ کب تک ان یاس انگیز خیالات کی آماجگاہ بنا رہے گا۔ اور میں کب تک تمہاری یاد میں یونہی جذب ہوتا رہوں گا؟ ـــ ریحانہ! یہ محض لفاظی و لسانی نہیں میں تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ میری راہ میں کوئی چیز حائل نہیں۔ للہ! بتادو! ہاں! کہدو چپکے سے چند الفاظ! کیونکر اس دردو کرب سے نجات ہوگی؟ کس طرح میرا بے قرار دل سکون پذیر ہوگا۔ ـ میں کب تک اس درد پیہم اور خلش مبہم سے دوچار رہوں گا؟ ـ اور کب تک یہ ہجوم شوق اور ازدہام تمنا کی دست درازیاں مجھ پر ہوتی رہیں گی ـــ آنسوؤں کے گوہر آبدار ریحانہ کی سحر طراز آنکھوں سے ٹپک کر انیس کے ہاتھوں کو نم کر گئے ـــ اعتراف محبت! کیا کہہ رہے ہو انیس؟ محسوس کرو اپنے الفاظ کی اہمیت کو ـ یا اللہ! کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟ نہیں ـ ایک سندر سپنا ـــ محض میرے خیالات کا اثر! ـــــ انیس! سنتے ہو! ـ مردوں کی محبت ابتدا میں چودھویں کے چاند کی مانند ہوتی ہے مگر ـــ بدر، رفتہ رفتہ ہلال بن کر، نفرت اور بے اعتنائی کی تاریک گھٹاؤں میں پوشیدہ ہو جاتا ہے ـ تم بھی مجھے بھول جاؤ گے انیس! ـــ

نہیں ریحانہ، یہ ممکن نہیں۔ میں تمہارا ہوں اور صرف تمہارا ـــ

(۸)

ناشاد شمسہ کے لیے انیس کا غیاب اور اس سے بعد اب ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ اس نے انیس کو متعدد خطوط لکھے مگر جواب میں لیت و لعل کے سوا کچھ نہ تھا۔ انیس کا بدلا ہوا رویہ شمسہ جیسی والہ و شیدا بیوی کے لیے کچھ کم صبر آزما نہ تھا ـــ اس نے خیال کیا کہ شاید انیس اس سے خفا ہے ـ وہم نے یقین کی صورت میں اختیار کر لی ـــ آخرش شمسہ اپنی خوشدامن کے مشورے اور اجازت سے گاؤں جانے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ اور اس نتیجہ پر پہونچتے ہی شمسہ نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا ـ دوسرے دن تمام انتظامات مکمل ہوتے ہی، وہ روانہ ہو گئی ـــ آہ! نادان شمسہ! بھولی چڑیا تو کیا جانے! مرد کا دل ـ یہ مریخ چشم، جنس، عادی ہے: صنف نازک کے جذبات سے کھیلنے اور انہیں مجروح کرنے کی ـــ شمسہ! تو عورت ہے! ـــ عورت صرف ایک سے محبت کر سکتی ہے ـ اور عمر میں صرف ایک مرتبہ ـ اس کے حریم دل میں، کسی نقش ثانی کا گذر نہیں ـ مگر ـــ مرد ـــ مرد کے دل کی حالت مثل آئینہ ہے ـ جو سامنے ہوا۔ اس کا عکس ہی منعکس ہوتا ہے۔

ہاں تو شمسہ کو انیس کے پاس آئے ہوئے ایک ہفتہ گذر گیا ـ اس دوران میں آخر الذکر کی یہی کوشش رہی کہ وہ شمسہ کے جذبات کا احترام کرے ـــ مگر تا بکے؟ انیس کے کردار میں اصلیت کا فقدان کوئی چھپانے سے چھپنے کی چیز نہ تھا ـــ ـ

(۹)

برسات کی ایک دلفریب اور سہاونی شام تھی ـ مطلع صاف تھا ـ پانی برس کر تھم چکا تھا ـ سامنے لگے ہوئے نیم کی پتیوں سے ٹپکنے والی بوندوں کی حالت بعینہ وہی تھی جو کہ شمسہ کی اشکبار پلکوں کی، پیہم گریہ وزاری کے بعد ـ وہ اپنی موجودہ حالت سے بیزار تھی ـ

شمسہ نے آج موقع پا کر انیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ـ کیوں انیس؟ تمہیں کیا ہو گیا تمہارا بدلا ہوا رویہ اور گرتی ہوئی صحت میرے لیے ناقابل برداشت ہو چکی ہے ـــ کچھ تو کہو! کیوں کھوے سے رہتے ہو؟ آخر تمہارے درد کا درماں؟ ـــ تمہارے دکھ کا بدل اور اس تکلیف کا ازالہ ممکن ہے یا نہیں؟ ـــ انیس جو پہلے ہی شمسہ کی غیر حالت اور اضطراب سے حد درجہ متاثر تھا ـ اپنی گلوگیر آواز میں یوں کہنے لگا شمسہ مجھے معاف کر دو! میں تمہارا مجرم ہوں ـ وہ دل جو کبھی تمہارا اور صرف تمہارا تھا، اب کسی اور کو سونپ چکا ـــ میں مجبور ہوں شمسہ! ـــــ مگر تمہارے آرام و آسایش

کا خیال تا دمِ مرگ بھی رکھوں گا۔ تم ابھی مجھے راستباز پاؤ گی۔
فرطِ گریہ سے انیس کی آواز سرمہ در گلو ہو کر رہ گئی۔

دوسرے دن، حرماں نصیب شمہ اپنے پلنگ پر مردہ پائی گئی۔ آنسوؤں کے چند موٹے موٹے قطرے اس کے زرد رخساروں پر ڈھلک کر رہ گئے تھے —— خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی۔
شمہ کے بعد انیس نے گاؤں کی رہائش اختیار کر لی۔ ریحانہ اب اس کی رفیقۂ حیات ہے —— دنیا کی ہر ایک مسرت اور ہر ایک خوشی گویا ان کے لیے ہی جنم لیتی ہے —— شمہ، اور اس کی موت قصۂ پارینہ ہو چکی ہے —— مگر آج بھی کبھی کبھی شمہ کے سرِ مزار، آم کے درخت پر کوئل کی کوک، اپنی زہرہ گداز آواز میں "پی کہاں" "پی کہاں" کہتی سنائی دیتی ہے

وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

مخفی (گلبرگہ)

گریز

دیکھ اے محوِ خود آرائی دیکھ
ہر طرف خون کی برساتیں ہیں
وحشت و غم کی فراوانی ہے
ایک سکتہ سا دلوں پر ہے پریشانی ہے
دستِ افلاس سے ہونے کو ہے پرزے پرزے
زیست کا پیرہنِ بوسیدہ
قصر والوں کے یہ رنگین منظر
آگ اگلتے سے نظر آتے ہیں
بند ہے راہِ سکوں بندۂ غربت کے لیے
اہلِ دولت کے دماغوں پہ رعونت ہے سوار
بےکسوں، غمزدوں، مجبوروں پر
ظلم ناقابلِ برداشت ہوا کرتا ہے

چاہتا ہوں کہ بدل دوں یہ نظام
یہ جو شعلے سے فروزاں ہیں بجھا دوں ان کو
ایسی حالت میں محبت کے ترانے کی میں روداد سنوں
مجھ کو فرصت ہی نہیں ہے
دیکھ اے جان، کہ یہاں پھرتے ہیں
سہمے سہمے سے جوانانِ غیور
جن کی ٹھوکر سے بدل سکتی ہیں
قوم کی بگڑی ہوئی تقدیریں
یہ جوانانِ غیور
جن کی نظروں میں ہے اک تیز سا نشتر پنہاں
لیکن ان کی یہ تباہی توبہ
چہرے افسردہ سے، آنکھوں میں علاماتِ جمود
روح خوابیدہ امنگیں مردہ
حوصلے پست ارادے مایوس
بھوک اور آہ کی یورش سے تمنائیں نڈھال
کھوئے کھوئے سے خیال
زندگی ان کی ہے ڈھلتی ہوئی رات
قلب پر اک بڑھاپا طاری
اپنے بیتاب سے جذبات کا خون لے کر
چاہتا ہوں کہ بدل دوں یہ نظام
اپنے پُرکیف ترانے نہ سنا
تاب سننے کی نہیں
جب مجھے اپنے فرائض سے ملے گی فرصت
جان دوں گا ترے آغوشِ سکوں پرور میں
لیکن اس وقت بھلا دے مجھ کو
اب مرے دل میں محبت کے وہ جذبات نہیں

تحسین سروری

خواب

وہ کاشی کی سہانی رات اب تک یاد ہے چندرا
اسی کی یاد سے سینہ میرا آباد ہے چندرا

ترا پانی کی لہروں میں ترنم زائیاں کرنا
ترا پانی کے آئینے میں حسن آرائیاں کرنا

وہ ہر ہر ریت کے ذرے پہ اپنی داستاں لکھنا
بیاں جو ہو نہیں سکتی ہیں وہ خاموشیاں لکھنا

وہ سطح آب پر تاروں کی چادر سی بچھا دینا
اور اس پر چاندنی کو تھپکیاں دیکر سلا دینا

کبھی کہنا کہ مجھ کو نیند سی محسوس ہوتی ہے
کبھی کہنا محبت تم سے کچھ مانوس ہوتی ہے

یہ کہتے کہتے پھر زانو پہ میرے سر کو رکھ لینا
اور آنکھیں بند کرکے مسکرا کر گدگدا دینا

وہ میرا تجھ میں کھو کر ہائے پھر مدہوش ہو جانا
وہ طوفانی تموج کا سکوں بردوش ہو جانا

جب حسن و عشق دونوں ملکے باہم مسکراتے ہیں
فرشتے آسمانوں پر خوشی کے گیت گاتے ہیں

وہ فردوسی تخیل میں ہمارا دل کے کھو جانا
مسرت سے ہواؤں کا وہ نکہت ریز ہو جانا

کبھی کہنا کہ لے فیاض تیرے ساتھ کھیلوں گی
میں تیرے ساتھ اس دنیا کا ہر دکھ درد جھیلونگی

میں تجھ کو یاد کرکے ساری دنیا کو بھلا دونگی
محبت کا تری اب اس طرح سے میں صلہ دونگی

سماء عشق پر جب اس طرح چھا جائنگے دونوں
ترنم ریز نغمے ہلکے پھر برسائیں گے دونوں

مگر وہ عہد و پیماں کیا ہوئے سمجھا تو دے چندرا
اسی بربط پہ اس نغمے کو اب پھر گا تو دے چندرا

تمہارا رات کو چھپ چھپ کے ملنا یاد ہے اب بھی
تمہاری یاد سے سینہ مرا آباد ہے اب بھی

سمجھتا تھا یہ ملکوتی محبت رنگ لائیگی
تمہاری یاد مجھکو خون کے آنسو رلائے گی

سمجھ میں آگیا اب راز اس دنیائے فانی کا
سنہرا خواب تھا وہ ہائے میری نوجوانی کا

مری سوئی ہوئی قسمت کو آ کر پھر جگا جاؤ
خزاں زندگی پر پھر بہاریں بن کے چھا جاؤ

میں تجھ پر دین بھی ایمان بھی قربان کردونگا
ترے صدقے میں تجھ پر جان بھی قربان کردونگا

وہ وادی گونجتی ہے ہاں اب بھی اپنے نغموں سے
چراغاں قلب میں ہوتا ہے اب بھی اپنے زخموں سے

فیاض

مضمون نگار حضرات

کاغذ مہنگا ہے اس لیے حجم کم کر دیا گیا ہے آپ سے
خواہش کی جاتی ہے کہ مضامین چھوٹے چھوٹے
لکھیں۔
اگر
مضمون واپس منگوانا ہو تو نہ صرف ٹکٹ
بلکہ واپسی کے لیے لفافہ بھی بھیجیے۔

منیجر

بادشاہوں کی باتیں

(۱) نصر بن احمد سامانی کو معلوم ہوا کہ ایک سوداگر کے پاس بیش قیمت ہیرا ہے۔ اور وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔ اس نے اسے دربار میں بلایا۔ لیکن جب ہیرے کو دیکھا تو حیران رہ گیا کیوں کہ یہ وہی ہیرا تھا جو اس کے خزانے سے چوری ہوا تھا۔ اس نے سوداگر سے پوچھا کہ یہ ہیرا کہاں سے لیا ہے۔ سوداگر نے ایک غلام کا نام لیا۔ امیر نے حکم دیا کہ فوراً غلام کو میرے حضور میں پیش کرو۔ غلام حاضر ہوا۔ تو تھر تھر کانپنے لگا امیر نے اسے دلاسا دیا۔ اور سوداگر کو چودہ ہزار روپیہ دیکر ہیرا خزانے میں داخل کر دیا۔ اور غلام بھی اسی سوداگر کو بخش دیا۔

(۲) ایک دمشقی شتربان نے امیر معاویہ کی عدالت میں ایک کوفی پر دعوےٰ دایر کیا۔ کہ اس نے میری اونٹنی چرالی ہے۔ امیر معاویہ نے اس کے نام سمن جاری کیا جب مدعی علیہ حاضر عدالت ہوا۔ تو مدعی نے پچاس گواہ پیش کیے جنہوں نے یہ گواہی دی کہ واقعی یہ اونٹنی دمشقی کی ہے۔ امیر نے اونٹنی اس کے حوالے کردی جب وہ چل دیا تو کوفی نے عرض کی ایہا الامیر یہ اونٹ تھا نہ کہ اونٹنی امیر معاویہ بے اختیار ہنس پڑا۔ اور اسے اونٹ کی رقم خزانۂ شاہی سے ادا کر دی۔

(۳) حجاج والی بصرہ نے ایک دن پھرتے پھراتے ہوئے ایک دہقان کو کھیت میں ہل چلاتے ہوئے دیکھا وہ اس کے پاس پہونچا۔ اور پوچھا کہ حجاج کیسا آدمی ہے۔ اس نے جواب دیا فاسق و فاجر غدار و بد کردار حجاج نے پوچھا کیا مجھے پہچانتا ہے اس نے جواب دیا نہیں۔ حجاج نے کہا میں ہوں حجاج دہقان نے کہا کیا تم مجھے پہچانتے ہو حجاج نے کہا نہیں دہقان نے کہا میں عبداللہ ابن زبیر کا ایک ادنا غلام ہوں۔ اور ہر سال میں تین دفعہ دیوانہ ہوجاتا ہوں۔ آج انہی میں سے ایک دن ہے۔ حجاج نے ہنس کر اس کا قصور معاف کر دیا۔

(۴) ہشام بن عبدالملک نے جو بے حد کریہہ المنظر تھا۔ ایک دفعہ صحرا میں پھرتے پھراتے ایک پیر مرد سے پوچھا۔ کہ تم کون ہو اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ پیر مرد نے کہا میں کوفے کا رہنے والا ہوں لیکن تمہیں میرے حسب و نسب سے مطلب بالفرض اگر میں شریف خاندان سے ہوں تو تمہیں کیا فائدہ۔ اگر میں نیچ قوم کا فرد ہوں تو تمہیں کیا ہشام نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم رذیل ہو اسی لیے تو حسب و نسب کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ جو شخص تمہارے خاندان سے نہیں۔ اس پر خدا کا شکر واجب ہے۔ پیر مرد نے پوچھا کہ آپ کس خاندان سے ہیں۔ ہشام نے کہا کہ میں قریشی ہوں اور بنی امیہ خاندان کا چشم و چراغ ہوں پیر مرد نے کہا اچھا تو تم اس خاندان کے فرد ہو جو زمانہ جہالت میں سود خوار اور بادہ خوار تھا۔ اور اب جبار ہیں۔ حجاج ملعون بھی تمہارے خاندان ہی کا ایک فرد تھا جس نے خانہ کعبہ پر پتھر برسائے تھے بنی امیہ کے اولاد بدکار اوسط طرار اور اب مکار ہیں۔ ہشام یہ معقول جواب سن کر چپ ہو رہا۔

(۵) ایک دن ہشام اپنے مصاحبوں سمیت اپنے ذاتی باغ کی سیر کو گیا۔ مصاحبوں نے پکے ہوئے پھل دیکھے تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ انہوں نے ہشام سے اجازت حاصل کیے بغیر پھل توڑ توڑ کر کھانے شروع کر دیے جب شکم سیر ہو گئے تو کہا خدا اس باغ کو حشر تک سرسبز و شاداب رکھے اور مالک کو برکت نصیب کرے۔ ہشام نے ہنس کر کہا۔ جب پھل ہی کوئی نہیں رہا۔ تو برکت کہاں سے آئے گی۔

(۶) ولید بن یزید کی شان میں عرب کے ایک شاعر نے قصیدہ لکھا۔ ولید نے خوش ہو کر حکم دیا کہ شاعر کو ہر شعر کے بدلے ۱۰۰۰ درہم دیے جائیں۔ قصیدے کے اشعار شمار کیے گئے تو پچاس کے قریب نکلے حسب الحکم پچاس ہزار دینار ادا کر دیے گئے۔ اور یہ پہلا بادشاہ ہے مسلمانوں میں جس نے سب سے پہلے اپنی شاعر نوازی کا ثبوت بہم پہنچایا۔

(۷) ایک دن خلیفہ منصور (عباسی) اپنے حجرے میں بیٹھے ہوئے تھا ایک پیر مرد کو نہایت تندہی سے کام کاج کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اسے پاس بلا کر پوچھا۔ بڑے میاں کیا وجہ ہے کہ امیروں اور بادشاہوں کی عمریں تھوڑی ہوا کرتی ہیں اور غریبوں کی عموماً زیادہ۔ بڈھے نے ہاتھ باندھ کر عرض کی جہاں پناہ دولتمندوں کی روزی یکمشت مل جاتی ہے۔ اس لیے ان کی عمریں تھوڑی ہوتی ہیں۔ اور غریبوں کو تھوڑا تھوڑا کام کاج کرنے کا موقع ملتا ہے اس لیے ان کی عمریں لمبی ہوا کرتی ہیں۔ منصور نے اس معقول جواب سے خوش ہو کر تین سو درہم عطا فرمائے۔ کچھ دنوں بعد ایک لڑکے کو محنت مزدوری کرتے ہوئے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور اس پیر مرد کی نسبت پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ تو کبھی کا فوت ہو چکا ہے۔ منصور نے ہنس کر کہا کہ اس نے اپنی روزی یکمشت پالی تھی اس لیے دنیا سے جلدی کوچ کر گیا۔

(۸) ایک دفعہ ایک باغی کو منصور کے روبرو پیش کیا گیا۔ منصور نے اسے ڈانٹتے ہوئے برا بھلا کہا باغی نے کہا کل تک میں آزاد تھا۔ تو تمہیں ہاتھ اٹھانے کی جرات نصیب نہیں تھی آج میں قسمت سے تمہارے ہاتھ آ گیا ہوں۔ اب تم جو سلوک چاہو کر سکتے ہو۔ لیکن اتنا سمجھ لو کہ اگر میں بھی گالی کے جواب میں گالی دوں تو تم میرا کیا بگاڑ سکو گے۔ میں نے تو یوں بھی زندگی سے ہاتھ دھو رکھے ہیں۔ منصور نے اس کا دلیرانہ جواب سن کر جان بخشی کر دی تھی۔

(۹) ایک دفعہ منصور کے ملازموں نے اسے اطلاع دی کہ فلاں رئیس مر گیا ہے۔ اور بے شمار مال و متاع پیچھے چھوڑ گیا ہے اگر حکم ہو تو اس کی جائیداد اور مال و متاع پر قبضہ کر لیا جائے منصور نے جواب دیا کہ جو شخص روئے زمین کی بادشاہی سے سیر نہیں ہوتا وہ یتیموں کا مال سے سیر نہیں کر سکتا۔

(۱۰) ایک دفعہ خلیفہ مہدی شکار کھیلتے ہوئے لشکریوں سے جدا ہو کر ایک اعرابی کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ میں بہت سخت بھوکا ہوں۔ مجھے کچھ کھانے کو لا دو۔ اعرابی نے اس کے تن و توش کو دیکھ کر جواب دیا کہ میرے ہاں آپ کے لائق کوئی چیز موجود نہیں۔ مہدی نے ہنس کر کہا۔ اس مذاق کو رہنے دو اور جو کچھ موجود ہو لے آؤ۔ اعرابی ایک جو کی روٹی لے آیا۔ مہدی نے روٹی کھانے کے بعد کہا کہ اور کچھ اعرابی دودھ لے آیا مہدی نے دودھ پی کر کہا کہ کچھ اور اعرابی شراب لے آیا۔ اور ایک پیالہ بھر کر مہدی کو دیا مہدی نے شراب کا پیالہ پی کر کہا کہ مجھے جانتے ہو میں کون ہوں۔ اعرابی نے کہا نہیں مہدی نے کہا میں امیر المومنین کا ایک لشکری ہوں۔ دوسرا پیالہ پینے کے بعد کہا۔ مجھے جانتے ہو میں کون ہوں اعرابی نے کہا۔ امیر المومنین کے لشکری مہدی نے کہا لشکری نہیں بلکہ ان کا مصاحب ہوں۔ تیسرا پیالہ پینے کے بعد کہا کہ مجھے جانتے ہو میں کون ہوں اعرابی نے کہا خلیفہ کے مصاحب مہدی نے کہا مصاحب نہیں بلکہ میں خود خلیفہ مہدی ہوں اعرابی نے یہ سن کر پیالہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ مہدی نے کہا ایک پیالہ اور اعرابی نے کہا معاف رکھیے مہدی نے پوچھا کیوں اعرابی نے کہا پہلا پیالہ پینے کے بعد تم نے کہا کہ میں ایک لشکری ہوں۔ اس کے بعد کہا کہ میں مصاحب ہوں اور اب کہتے ہو کہ خلیفہ ہوں چوتھا پیالہ پینے کے بعد بلاشبہ تم کہو گے کہ میں رسول اللہ ہوں اور پانچویں دفعہ کہو گے کہ میں خدا ہوں۔ مہدی یہ سن کر ہنس پڑا۔ اتنے میں اس کے لشکری بھی تلاش کرتے ہوئے آن پہنچے۔ مہدی نے اسے انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔ اعرابی انعام پا کر بیحد خوش ہوا۔ اور کہا اشہد انک صادق لو ادعیت الرابعۃ والخامسۃ۔

(۱۱) ایک دفعہ موسیٰ ہادی مصاحبوں سمیت باغ کی سیر کر رہا تھا۔ کہ ایک باغی ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے آن پہونچا۔ خلیفے کے ساتھی جان کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے گھوڑے سے اتر پڑا۔ اتنے میں باغی بھی قریب پہونچ چکا تھا۔ ہادی نے اپنے سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا کہ دیکھتے کیا ہو اس مردود کا سر قلم کر دو۔ باغی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کہ شاید پیچھے سے کوئی حملہ کر رہا ہے۔ خلیفہ نے دوڑ کر تلوار ہاتھ سے چھین لی۔ اور ایک ہی وار میں سر تن سے جدا کر دیا۔

(۱۲) فضل بن یحییٰ برمکی علم و فضل اور جود و سخا میں حاتم گذرا ہے۔ اس عہد کے شاعر اس کی تعریف میں قصیدے لکھ کر منہ مانگا انعام پاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شاعر نے اس کی تعریف میں یہ شعر کہا ؎

لوگ تو ڈھونڈھتے ہیں فضل خدا
فضل خود ڈھونڈھتا ہے سائل کو

فضل نے خوش ہو کر اسے بہت کچھ انعام دیا۔ مروان بن ابی حفصہ ۔ باری شاعر تھا بیان کرتا ہے۔ کہ ایک دفعہ میں سلام کے لیے فضل کی خدمت میں حاضر ہوا اور فضل نے مجھے سات لاکھ درہم عطا کیے۔ اسی طرح جعفر برمکی نے اصمعی شاعر کو وقتاً فوقتاً جو رقومات عطا کیں ان کی میزان تین لاکھ سے زاید بیان کی جاتی ہے۔

(۱۳) ایک دفعہ مروان بن ابی جعفر نے ہارون رشید عباسی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر سنایا خلیفہ نے اسے پانچ ہزار درہم ایک گرانبہا خلعت دو غلام رومی اور دو گھوڑے انعام دیے۔ مورخین کا بیان ہے کہ علما اور فضلا و شعرا کا مجمع جو ہارون رشید کے دربار میں تھا۔ اور کسی مسلمان بادشاہ کو نصیب نہیں ہوا۔

(۱۴) زبیدہ خاتون چاہتی تھیں کہ ہارون رشید کے بعد میرا بیٹا امین تخت و تاج کا مالک ہو۔ اسی خیال کی بنا پر وہ روزانہ مامون کے خلاف اس کے کان بھرا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ایک مدعی نبوت گرفتار ہو کر ہارون رشید کے دربار میں پیش ہوا۔ ہارون رشید نے حکم دیا کہ تازیانوں سے اس کی خوب خاطر تواضع کرو تاکہ اس کا دماغ درست ہو جائے جب اسے کوڑے لگنے شروع ہوئے۔ تو اس نے شور و غل سے آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔ مامون جو سب سے پچھلی قطار میں ایک تماشائی کی حیثیت سے کھڑا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اس سے نہ رہا گیا مدعی نبوت کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ اٹھا۔ فاصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل ہارون رشید اس کی فطری ذہانت ملاحظہ کر کے دنگ رہ گیا اور بے اختیار ہو کر کہا صدق رسول اللہ اولادنا اکبادنا۔

(۱۵) ایک دفعہ ہارون رشید رقہ کے نواح میں شکار کھیل رہا تھا کہ ایک متصوفی زاہد نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا اے ظالم رشید خدا سے ڈر رشید نے اپنے مصاحب ابراہیم بن عثمان کو کہا کہ اسے ہمراہ لے لو اور بغداد پہونچ کر میرے حضور میں پیش کرنا۔ بغداد پہونچ کر زاہد کو بلایا۔ اور اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے بعد کہا۔ کہ میں تجھ سے ایک بات پوچھتا ہوں سوچ سمجھ کر جواب دینا وہ یہ کہ میں زیادہ ظالم ہوں یا فرعون اس نے کہا فرعون پھر پوچھا کہ تم اچھے ہو یا موسیٰ و ہارون اس نے کہا کہ وہ دونوں معصوم پیغمبر اور مہبط وحی تھے۔ مجھے ان سے کیا نسبت۔ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ خلیفے نے کہا جب وہ مبعوث برسالت ہوئے تھے۔ تو ان کو خدا تعالیٰ سے حکم ملا تھا۔ کہ فرعون کو نرمی سے خطاب کرنا۔ اب تم ہی انصاف سے کہو کہ تم مجھے ظالم کہنے میں کہاں تک حق بجانب ہو۔ اس نے دست بستہ عرض کی کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے معافی چاہتا ہوں خلیفے نے اس کا قصور معاف کرتے ہوئے اسے آٹھ ہزار درہم بطور انعام دیے۔

مامون نے جب خوشی عروسی کے موقع پر علما و فضلا اور شعرا میں لاکھوں کے حساب سے انعامات تقسیم کیے لیکن جب مفضل

عروسی میں طلائی شمعدان جس کا وزن چالیس من تھا لایا گیا۔ تو اس نے اسکی بابت اسے واپس کرا دیا کہ یہ اسراف میں داخل ہے۔ ...

(۱۶) واقدی نامی مورخ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ تنگدستی کی حالت میں عید رمضان آ گئی۔ میری بیوی نے اصرار کیا کہ لوگوں کے بچے عید کے دن زرق برق پوشاک پہن کر عیدگاہ کو جائیں گے لیکن افسوس ہے کہ میرا یتیم بچہ پرانا لباس پہنے ہوئے۔ میرے دل پر بیوی کے اس فقرے نے تیر و نشتر کا کام کیا۔ میں نے اپنے جانی دوست ہاشمی کو ایک چٹھی لکھی۔ کہ میرا ہاتھ تنگ ہے۔ اس موقعہ پر امداد فرما کر ممنون فرمائیے۔ اس نے مجھے ایک تھیلی بھیجی جس میں تقریباً ایک ہزار درہم تھے۔ میں ابھی تھیلی کھولنے بھی نہ پایا تھا کہ میرے ایک دوست کا قاصد عین موقعہ پر پہونچ گیا جس میں تنگدستی اور افلاس کا رونا رویا گیا تھا۔ میں نے وہ تھیلی جوں کی توں اس کے حوالے کر دی۔ اور خود شرم کے مارے مسجد میں شب باش رہا۔ دوسرے دن علی الصباح ہاشمی وہی تھیلی لیے ہوئے میرے پاس آیا۔ اور مجھ سے پوچھا کہ جو تھیلی میں نے تمہیں بھیجی تھی۔ وہ کہاں ہے میں نے تمام قصہ گوش گذار کیا۔ اس نے کہا وہ تھیلی جب اسکو ملی تو میں نے قاصد بھیجکر اس سے منگوالی۔ میں اسے ساتھ لے کر گھر پہنچا۔ اور بیوی کے سامنے یہ سارا قصہ بیان کیا۔ کہ میں رات کو اسی لیے مسجد میں شب باش رہا ہوں۔ میری بیوی نے میری دوست نوازی کا قصہ سن کر مجھے شاباش دی۔ ہاشمی نے ۱۰۰ درہم میری بیوی کو اس شاباشی کے صلے میں دیے اور بقایا نو سو درہموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ خبر شدہ شدہ مامون رشید کے کانوں تک بھی جا پہونچی اس نے مجھے دربار میں بلایا۔ میں نے حاضر ہو کر تمام روداد اول سے آخر تک کہہ سنائی۔ مامون رشید میں دوست نوازی کے جذبے سے متاثر ہو کر مجھے چھ ہزار دینار عطا فرمائے۔ اور حکم دیا کہ یہ انعام بھی اسی طرح تقسیم کیا جائے جس طرح تھیلی تین حصوں میں بانٹی گئی تھی۔ چنانچہ حسب الحکم میں نے ویسا ہی کیا۔

(۱۷) ایک دفعہ ایک شخص کو مامون رشید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ مامون نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے اس نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں۔ مامون نے کہا وہ تو بے شمار معجزات ید بیضا عصا وغیرہ کا مالک ہے۔ اگر تم بھی اسی طرح کا ایک معجزہ دکھا دو۔ تو میں تم پر ایمان لے آؤں گا۔ مدعی نبوت نے کہا فرعون نے دعوئ خدائی کیا تھا۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو معجزات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اگر تم بھی اسی طرح دعوے خدائی کر دو۔ تو میں بھی موسیٰ کی طرح معجزات پیش کر سکتا ہوں۔ مامون ہنس پڑا اور اس کو انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔

(۱۸) ایک دفعہ کوفی لوگ عامل کوفہ کی شکایت لے کر دربار میں حاضر ہوئے اور کہا کہ پہلے سال جب وہ عامل مقرر ہوا۔ تو ہم نے اثاث البیت فروخت کر کے مالیہ ادا کیا۔ دوسرے سال ذخائر وغیرہ بیچ کر امسال دربار خلافت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ ہم بالکل مفلس ہو چکے ہیں اب کچھ دیں تو کہاں سے دیں۔ مامون رشید نے کہا تم جھوٹ بکتے ہو۔ میرا عامل ایسی صفات رذیلہ کا مالک نہیں جو تم نے بیان کی ہیں۔ وہ نیک نفس پاک باطن اور رعایا پرور ہے۔ ایک حاضر جواب نے دست بستہ عرض کی۔ جہاں پناہ کا فرمانا درست ہے۔ واقعی وہ عامل انصاف پسند ہے۔ لیکن جب ایسا ہے تو اس نعمت الٰہی کو صرف ہمارے لیے مخصوص رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا اس صورت میں ماتحت رعایا کی حق تلفی نہیں ہو رہی۔ مامون رشید یہ معقول جواب سنکر چپ ہو رہا۔

(۱۹) المعتضد باللہ نے ایک دفعہ ایک غماز کو قید کر دیا جب اسے زندان میں رہتے ہوئے کافی عرصہ گذر گیا تو ان کا ایک دوست پندرہ ہزار دینار لے کر خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ خلیفہ نے کہا کہ اگر تم اس کی مثل اور کوئی شریر آدمی ڈھونڈھ کے لا دو تو میں

تمہیں پندرہ ہزار دینار بطور انعام دے کر تمہارے دوست کو
رہا کر دوں گا۔ اور اس کی جگہ اس کو قید کر دوں گا۔ وہ یہ
سنکر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

(۲۰) ایک دفعہ مستنصر باللہ عید کا چاند دیکھنے کو
چھت پر ٹہل رہا تھا اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی تو اسے
بغداد میں ہر گھر میں دھلے ہوئے کپڑے لٹکتے دکھائی دیے۔
خلیفہ نے وزیر سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وزیر نے
کہا جہاں پناہ یہ لوگ غریب ہونے کے باعث نئے کپڑے
خریدنے کی توفیق نہیں رکھتے۔ یہ واقعہ دیکھ کر خلیفہ بے حد
متاثر ہوا۔ اور حکم دیا کہ اسی وقت ایک ایک طلائی صندوق
جو سونے چاندی سے بھرا ہوا ہر گھر میں پہونچا دیا جائے۔
حکم ملتے ہی فوراً تعمیل ہوئی۔

(۲۱) سلطان علاء الدین جہانسوز شکست کھا کر جب زندہ
گرفتار ہو کر سلطان سنجر کے روبرو پیش ہوا تو سلطان نے
حکم دیا کہ اس کے پاؤں میں لوہے کی بھاری بیڑیاں
پہنا دی جائیں۔ علاء الدین نے کہا جہاں پناہ میرے ساتھ
وہی سلوک کیا جائے۔ جو میں نے آپ کے لئے تجویز کیا تھا
سلطان سنجر نے پوچھا تو جواب دیا کہ میں نے آپ کے لیے
چاندی کی بیڑیاں تیار کرائی تھیں۔ سلطان سنجر نے اس کو
وہی بیڑیاں پہنائیں رفتہ رفتہ بادشاہ کے کانوں تک یہ
خبر جا پہونچی کہ علاء الدین اپنے وقت کا بہترین شاعر ہے
سلطان نے اس کو اپنے ندیموں میں داخل کر لیا۔ ایک دن
سلطان سنجر نے ایک تھال مروارید کا اسے عطا کیا اس نے
فوراً یہ اشعار موزوں کر کے سنائے ؎

بگرفت و نہ کشت شہ مرا در صفت کیں
با آنکہ بدم کشتنی از روے یقیں
و آنگہ بطبق میدہدم در ثمیں
بخشائش و بخششم چناں کرد و چنیں

سلطان سنجر نے خوش ہو کر اسے بدستور سابق غور کی حکومت
تفویض کر دی۔

(۲۲) خطیب تو شیخ زینی ملک فخر الدین کے مصاحبوں کے
زمرے میں شامل تھا۔ اسے خزانہ شاہی سے ہر ماہ تقریباً
ایک ہزار درہم ملتے تھے۔ زینی عیاش تھا۔ انسان تھا شراب
کباب کا دلدادہ تھا۔ قناعت کے نام سے کوسوں بھاگتا
تھا۔ فخر الدین اور زینی دونوں کی طبیعتیں مختلف واقع ہوئی
تھیں۔ باوجود انعام و اکرام ملنے کے بھی اس کا دل اپنے
مربی کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ ایک دن خدا جانے کس
خیال کے ماتحت چپکے سے چل دیا۔ اور شاہ علی ابن ملک
نصیر الدین سیستانی کے ہاں پہونچکر طرح اقامت ڈالدی۔
اور اس کے سامنے اپنے محسن کی برائیاں بیان کر کے
جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے۔ شاہ علی نے فخر الدین کی
ہجو سن کر اسے بائیس دینار دیے اور حکم دیا کہ اسی وقت
میری قلمرو سے نکل جائے۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی
کہ ایک بے نظیر شاعر کو اس طرح کورا جواب دینا شایاں نہیں
آپ کس قصور کی بنا پر اسے دیس نکالا دے رہے ہیں۔
شاہ علی نے جواب دیا یہ شخص بے وفا ہے۔ حق شناس نہیں
بارہ سال جس کا نمک کھایا اب اسی کی ہجو بیان کرتا پھرتا
ہے۔ کل کو مجھ سے ناراض ہوگا تو میرے ساتھ بھی اسی
طرح پیش آئے گا۔ اس کے بعد یہ شعر پڑھا اور اسے اپنے
ملک سے نکال دیا ؎

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد
بے گماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد

(۲۳) ایک تیر انداز دو ترکمان نے کرقاآن والی توران
کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا بڑے میاں
کیسے آنا ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ مجھ پر ستر ہزار درہم قرضہ
ہے۔ سوائے آپ کی نظر عنایت کے اور کوئی صورت
ادائیگی کی نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر سال ستر ہزار تیر
کمان تیار کر کے خزانہ شاہی میں داخل کیا کروں گا۔ بادشاہ

نے اس کی شاعری ملاحظہ فرما کر حکم دیا کہ اسے ایک لاکھ درہم
دیے جائیں۔ تیر انداز یاں سب کو ایک گٹھڑی میں باندھ کر
اٹھانے کا حکم [illegible] تنگی کی وجہ سے ناکام رہا۔ قاآن اس کی کوششوں کو
ناکام دیکھ کر ہنس پڑا۔ اور [illegible] ایک بار پھر داد کے لیے
بخش دیا۔

(۲۴) ایک شیرازی [illegible] قاآن کی خدمت میں حاضر ہو کر
بیان کیا کہ میں مقروض ہوں اور قرض خواہوں کے ہاتھوں
تنگ آ کر آپ کے ہاں داد خواہی کے لیے آیا ہوں۔ بادشاہ نے
پوچھا کتنا قرضہ ہے۔ اس نے جواب دیا پانچ [illegible] پچاس
ہزار دینار۔ قاآن نے حکم دیا کہ اسے ایک لاکھ دینار دیے جائیں۔ دو
خزانچی نے کہا کہ ضرورت سے زیادہ رقم عطا کرنی فضول
خرچی ہے۔ قاآن نے کہا بیچارہ کہاں کہاں کی خاک اڑاتا
ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ اس کے دور دراز سفر کے مقابلے
میں یہ رقم کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

(۲۵) ایک دفعہ ایک ہندستانی طوطے کو قاآن کا نام
سکھا پڑھا کر ایک قافلے کے ہمراہ قراقرم کو چل دیا۔ اتفاق کی بات
کہ طوطا ترکستان کی سردی اور برفباری کی تاب نہ لا کر راستے
ہی میں مر گیا۔ جب وہ قافلے کے ہمراہ قراقرم پہنچا۔ تو دل شکستہ
سا ہو کر سرائے کے ایک گوشے میں مقیم ہو گیا۔ شدہ شدہ یہ خبر
قاآن کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ اس نے حکم دیا کہ اس
ہندستانی کو فوراً میرے حضور میں پیش کرو۔ اور جو کچھ [illegible]
اسے خزانہ شاہی سے ادا کر دو۔ طوطے کا مالک [illegible] وہ طوطا
لے کر دربار میں پیش ہوا۔ اور ایک لاکھ دینار مانگے قاآن
نے اسی وقت خزانچی کو حکم دیا کہ اسے دے دیے جائیں۔

(۲۶) ایک دفعہ ایک شخص سے زر و جواہر کی تھیلی کہیں گم
ہو گئی۔ اس نے منادی کرائی کہ جس شخص کو تھیلی ملے۔ اگر وہ
مجھ کو لا دے گا تو میں اس کو آدھی تھیلی بانٹ دوں گا۔ اتفاقاً
تھیلی ایک مسلمان کے ہاتھ لگی۔ وہ اسی کے پاس لے گیا
تھیلی کو صحیح و سالم پا کر اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے سب کچھ
ٹھیک ٹھاک پا کر اس سے کہا۔ کہ اتنی رقم جو اس سے کم ہے
وہ بھی [illegible] مسلمان بیچارہ ششدر رہ گیا۔ کہ اب تو نیکی برباد گناہ
لازم والی ضرب المثل مجھ پر صادق آ گئی۔ اس بیچارے نے بہت
کچھ منت سماجت کی لیکن وہ نہ مانا۔ آخر یہ معاملہ طول پکڑ گیا
[illegible] اور کوتوال نے کسی طرح صحیح نتیجے تک نہ پہنچنے کی صورت میں
اس معاملے کو قاآن کی خدمت میں پہنچایا۔ قاآن نے مسلمان
کو بلا کر کہا۔ کہ تم اس بات کی قسم کھاؤ۔ مسلمان نے قسم کھائی کہ مجھے
تھیلی جس طرح ملی تھی جوں کی توں مالک کو پہنچا دی ہے اس کے
بعد تھیلی کے مالک نے قسم اٹھائی۔ کہ اتنی رقم تھیلی سے کم ہے
قاآن نے تھیلی [illegible] کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ کہ اس میں
مزید روپیہ پیسہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ بیچارو۔ تمہارا مال ہے
مسلمان تھیلی لے کر چلتا بنا اور وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

(۲۷) مولانا سعد الدین تفتازانی کی خدمت میں حاضر ہو کر
ایک شخص نے کہا حضرت مولانا ہم تو آپ کو اہل رجال میں سے
گمان کرتے تھے لیکن آپ تو اہل لنا میں سے ہیں۔ مولانا نے ہنس کر
فرمایا بیوقوف کیا تو نے یہ کبھی نہیں سنا الرجال من النار (رجال اور
تفتازان دونوں ولایت نسا کے گاؤں ہیں)

(۲۸) مولانا حسن شاہ غزل و ہزل کے قادر الکلام شاعر تھے
چنانچہ ایک شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

در شعر و در ہزلیے در فضل و در ادب
نے در [illegible] چه [illegible] در عرب

ایام جوانی میں میرزا سلطان محمد کے ندیم خاص تھے۔ ایک دن
میرزا کے سامنے سلاطین ماضیہ کے اوصاف بیان کر رہے
تھے۔ کہ میرزا نے بات کاٹ کر کہا۔ مولانا مجھ میں کیا عیب
دیکھتے ہو۔ مولانا نے کہا تم بہت واقع ہوئے ہو۔ میرزا
نے کہا کوئی ثبوت [illegible] کہا آپ نے ایک دفعہ خزانچی کو
کہا تھا کہ مولانا حسن شاہ کو دس ہزار دینار دے دو جو آج تک تمہارے
ذمہ واجب الادا ہیں۔ میرزا نے ہنس کر خزانچی کو حکم دیا کہ پانچ ہزار
دینار ابھی مولانا حسن شاہ کو دے دو۔

صابر سنبھلوی

فرخندہ بنیاد کا ہر دلعزیز سینما جو صرف منتخب فلموں کیلئے ممتاز ہے
زمیندار
خزانچی اور خاندان کے تجربوں کے ساتھ پنچولی آرٹ
پکچرز نے اپنی پوری صلاحیتیں اس فلم پر صرف کر دی ہیں
شانتا آپٹے۔ اسماعیل۔ اختری
غلام محمد۔ اجمل
الٹی گنگا
منروا کا تراحیہ فلم جو ایک ہزار چٹکیوں اور ایک
لاکھ قہقہوں سے مل کر بنتا ہے۔
رومیلا۔ صادق علی۔ بنرجی۔ گلاب
سعادت وغیرہ
آنے والے
فلم
پرارتھنا
موتی لال اور ستیا دیوی نے ہزاروں
دلکشیاں اس میں بھر دی ہیں۔ منروا کے
اسٹوڈیو میں تیار کیا گیا ہے
نشاط سینما
(چادر گھاٹ حیدرآباد دکن)

شاہد بازار

چوک کی جانب ہوا اک روز شاعر کا گذر
سینکڑوں رنگینیاں بکھری ہوئی آئیں نظر
لمبے لمبے بال، نیلے، لال، پیلے پیرہن
سرخ لب، مخمور آنکھیں اور جبیں پرشکن
وہ لٹیں کھولے چلی آتی ہے لہراتی ہوئی
جیسے ناگن ہر قدم پہ پیچ و خم کھاتی ہوئی
گنگناتی، مسکراتی، ناز فرماتی ہوئی
دیکھتی، رکتی، لجاتی، بل کھاتی ہوئی
تیغ ابرو سے نگاہوں کو جلا دیتی ہوئی
اور نظربازوں کو نظاروں کا صلہ دیتی ہوئی
چال متوالی، رسیلی آنکھ، نظریں تیز تیز
پنکھڑی سے ہونٹ پر موج تبسم عطر بیز
ابروؤں سے ضبط دل کا امتحاں کرتی ہوئی
آنکھ کے ساغر سے پیروں کو جواں کرتی ہوئی
نوجوانی کی رگوں کا خون گرماتی ہوئی
شعلۂ رخ سے دلوں کی آگ بھڑکاتی ہوئی
تشنہ باز شوق سے اک گونہ کتراتی ہوئی
مسکرا کر منہ پہ آنچل کا سرا لاتی ہوئی
چشم میگوں سے شراب شوق چھلکاتی ہوئی
ہوش والوں کو جنوں کے راز بتلاتی ہوئی
زاہدوں کو مے پرستی کا سبق دیتی ہوئی
دامن عقل و خرد کی دھجیاں کرتی ہوئی
مصحف رخ پر گرا لے ایک جالی کا نقاب
ہلکے ہلکے بادلوں میں جیسے آئے آفتاب

مچ رہا ہے محفل رنداں میں شور نائے و نوش
ساقی و مطرب چلے آتے ہیں میخانہ بدوش
دل میں شاعر کے ہوا جذب پرستش بیقرار
سینکڑوں نغمے لیے آگے بڑھا دیوانہ وار
بارگاہ حسن میں پہونچا تو آنکھیں کھل گئیں
حسن کی پوجا تھی غرض، خود وہ جبیں جھک گئیں
بے نیاز حسن کی فطرت ہے عاشق کا نیاز
جھک چلا جب حسن سمجھو ہو گیا بے برگ و ساز
تھرتھرائی روح شاعر کی نگاہیں جھک گئیں
دل کی کلیاں کھل نہ پائی تھیں وہیں مرجھا گئیں
سامنے ہو حسن رسوا اور شاعر مر نہ جائے
خون آنکھوں سے نہ برسے اور وہ دامن تر نہ جائے
حسن تھا لیکن پڑے تھے سینکڑوں گندے نقاب
کھا رہی تھی روح بار معصیت سے پیچ و تاب
حسن جو انمول ہے وہ کوڑیوں کے مول تھا
بے بہا نظروں میں اُنکو کیسے شاعر تولتا
حسن بازاروں میں آ کر حسن رہ سکتا نہیں
دست گلچیں میں کنول شاداب ہو سکتا نہیں
حسن کے پھولوں کو چھو سکتا نہیں گلچیں کا ہاتھ
جلوہ گاہ حسن ہے بالاتر از لات و منات
جو پجاری خود ہے اسکی کوئی پوجا کیا کرے
خود ہی جو افتادہ ہو قدموں پہ اسکے کیا گرے
پھول گلشن میں کھلے ہیں بے نیاز رنگ و بو
آپ سے ہے اپنی بے پروا چمن کی آبرو
شاہ خاور آسماں پر ہو رہا ہے جلوہ بار
کائنات دل کا ہر ذرہ ہوا ہے بے قرار
چاند کی محفل ہوئی برہم ستارے چھپ گئے
کام کیا سورج کو اس سے مرنے والے مر گئے
قمریوں کا شور ہو یا نغمہ ہائے عندلیب

التفات گل سے ہے تقدیر بکی بے نصیب

آب جو کا طائفہ جاتا ہے ساز وں کے ساتھ
کھیلتا گاتا بجاتا سینکڑوں نغموں کے ساتھ

رقص میں ہیں سننے والوں کے میرے مستانہ وار
پر کہاں آتا ہے موجوں کے مسافر کو خیال

داد انسانی لبوں کی اس کو گوارا ہی نہیں
عاشقوں سے فطرت معصوم شرماتی نہیں

عشق ہے ایمان شاعر حسن ہے معبود عشق
اک تجلی شرط ہے ہر طور ہے مسجود ہے

نکہت کاظمی (لکھنوی)

سرمایہ دار کی عید

عید میں آرائش و تزئین کا تجھکو شوق ہے
تیری گردن میں روایات کہن کا طوق ہے

تیرے ملبوسات تیرا کر و فر، یہ اہتمام
تو اسیر رنگ و بو ہے اور خواہش کا غلام

زیب و آرائش سے ہے گھر تیرا عشرت کدہ
تیری محفل میں نہیں ہے کوئی بھی آفت زدہ

یہ ہجوم عیش و عشرت یہ ہوائے رنگ و بو
مست ہے اپنی جگہ پی کر غریبوں کا لہو

کبر و نخوت کا نمونہ تیری ہستی کا وقار
مفلس و بیکس کی حالت، تیری آنکھوں کا خمار

عید کی خیرات کو آیا ہے در پہ اک فقیر
تو نے یہ سمجھا کہ آیا ہے نحوست کا سفیر

اس قدر دشنام کی بوچھار اک نادار پر
تف ہے! تیرے کبر و نخوت پر ترے کردار پر

مفلس و نادار تیرے گھر پہ ٹھوکر کھا سکا
توڑ کر دل تو بناتا ہے تمنا کے مزار

یہ شرافت، یہ مروت، یہ محبت ہائے ہائے
کس قدر سنگین ہے طرز شقاوت ہائے ہائے

اپنی دولت پہ بہت مغرور ہے نازاں ہے تو
جور و استبداد سے شاداں ہے تو فرحاں ہے تو

تیرا یہ رنگ تکبر، تیرا ظلم بے حساب
خود زمانہ تجھکو دیگا تیری نخوت کا جواب

آہ سوزاں کا اثر دیکھے گا تو سرمایہ دار
بد دعاؤں سے غریبوں کی بنے گا زشت خوار

تیری دولت خود بنا دے گی تجھے اک دن حقیر
اور تری اولاد بن جائے گی محتاج و فقیر

اپنی اس نخوت مزاجی کا صلہ پائیگا تو
روکھی، سوکھی روٹیوں کو بھی ترس جائیگا تو

عظیم (عثمانیہ)

کاغذ مہنگا ہے

اس لیے حجم کم کر دیا گیا ہے۔
اس لیے لمبے مضامین کو کم کر دیا گیا ہے۔
اس لیے آپ سے خواہش کی جاتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے مضامین لکھیں۔

ہر چیز مہنگی ہے

اس لیے آپ ہندستانی ادب پر بار نہ ڈالیں۔
آپ کو جواب چاہیے تو جوابی کارڈ لکھیے۔
مضمون واپس منگوانا ہو تو نہ صرف ٹکٹ بلکہ واپسی کے لیے لفافہ بھی بھیجیے۔

دس بجے
۱۲
۱۱
۱۰
۹
۸
۷
۱

مکان میں ہی دفن کر دیا گیا ہے۔ مگر اس کا ذکر تک بھی نہیں کرتی۔ تعجب کی بات ہے کہ کس طرح دماغ ان باتوں کو بھول جاتا ہے۔ جن کا بھلانا خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔

جنرل۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جینا دوبھر ہو جاتا۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ لوگوں کی جان چیزوں میں ہے۔ لاہور کے نزدیک مجھے ایک ایسی بوڑھی عورت ملی جو اپنا مٹکی ٹڑی اپنی بغل میں لیے جا رہی تھی۔ اس کو درحقیقت ریل میں لے جانے کی اجازت نہیں ملی تو وہ پیدل ہی چل پڑی باوجود اس کے کہ تمام راستے میں ہوائی جہاز آگ برسا رہے تھے۔

سوداگر۔ ہاں۔ اب میں بھی ان لوگوں کو بھول گیا ہوں۔ جن کے لیے میں جیتا تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کاش میں نے زیادہ وقت انسانوں پر صرف کیا ہوتا۔ بہ نسبت چیزوں کے آپ نے اس کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے نزدیک محض مجسمہ ہے۔

جنرل۔ صاحب ہمارے پیشے میں تو جانوں کا سوال اٹھتا ہی نہیں ہم تو طاقت فوجوں اور ہونا جانتے ہیں۔ ورنہ شاید ہی ہم ہوش میں رہ سکیں۔

پادری۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اب چیزیں نہیں رہی ہیں اور ہم پھر ایک بار جانوں اور انسانوں کے معنے اور قیمت کو سوچ سکتے ہیں

جنرل۔ آخاہ پادری صاحب۔ میں نے تو آپ کو دیکھا ہی نہیں

سوداگر۔ آئیے تشریف رکھیے۔ یہاں پر کچھ وہاں سے زیادہ گرم ہے۔ کچھ کوکو نوش فرمایئے۔

پادری۔ شکریہ (وہ پیتا ہے) خوب ہے۔ آپ نے چیزوں کے متعلق جو رائے ظاہر کی مجھے سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میں خود بھی اب اسی نتیجے پر پہونچا ہوں۔

جنرل۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ لوگ انسان اور روح اور جرم اور گناہ اور اور چیزوں پر ہی سوچتے ہوں گے

پادری۔ جی ہاں ضرور۔ اور ہم کو چاہیے۔ میں اپنی گرجا پر روز کیا کرتا تھا۔

سوداگر۔ مناسب۔ اچھا تو آپ مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پادری۔ جی میرا مطلب روحانی نہیں تھا۔ میرا مطلب نقش اور گارا۔ اور رنگین شیشے وغیرہ وغیرہ۔ مگر جب کل میں نذر چڑھانے گیا تو گرجا جل رہا تھا۔ چھت گر چکی تھی۔ اور آپ جانتے ہیں میں نے اس وقت کیا سوچا۔ میں اس کے بعد زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں جی رہا ہوں۔ میں نے سینکڑوں کو (جو میرے اپنے صنف کے آدمیوں کی ہے) سڑک کے اوپر جاتے دیکھا۔ جو انسان نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ بلکہ چیزوں کے ڈھیر (اور ہیں) میرا مذہب آ جاتا تھا (میرا مذہب ان کے درمیان تھا)

طالب العلم۔ اور میرا ہسپتال بھی نہیں رہا تھا۔

جنرل۔ (دٹے چینی سے) کیوں ..... پادری صاحب آپ ان لوگوں میں سے کسی کو جانتے ہیں۔

پادری۔ بہتوں کو۔

جنرل۔ یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں

پادری۔ زیادہ تر دارسلسے۔ وہ شخص جو کہ ریورنڈ ونگر لو فوجیوں کے ساتھ تاش کھیل رہا ہے وہ زرنادس نجوم کا پروفیسر تھا۔ (اس کو بلاتا ہے) پروفیسر صاحب۔

پروفیسر۔

پادری۔ آداب مجلس کے خلاف تو نہ جانیے۔ آپ ہار رہے ہیں تو کیا۔

پروفیسر۔ آپ تاش کو کیا جانیں

پادری۔ میں گناہگاروں کی بات تو سنتا ہوں۔

جنرل۔ کہیے پروفیسر صاحب۔ آپ تو سائنس دان ہیں آپ کی ان باتوں کے متعلق کیا رائے ہے۔ ہم یہ بحث کر رہے تھے کہ کس پر اعتبار کیا جائے انسانوں پر یا چیزوں پر

میں انسانوں پر اعتبار کرتا ہوں۔ جن کو بے جان چیزوں کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

پادری۔ میں آدمیوں پر بھروسا کرتا ہوں مگر جب ان کے گناہ معاف کر دیے جائیں۔

طالبعلم۔ میں آدمیوں اور چیزوں دونوں کو مانتا ہوں۔ نہیں وہ جدا نہیں کی جا سکتیں

پروفیسر۔ جناب والا میں آج سنسان بے برگ و گیاہ میدان میں چل کر آ رہا ہوں۔ اور اس وقت میں کسی کو نہیں مانتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ وقت اور جگہ موقع علمی گفتگو کا ہے۔ میں نہیں سمجھتا میں تو یہ سوچکر اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ چاند کو دیکھنے والا ایک نجومی جو ہم لوگوں سے جو پاگل پن پر بحث کر رہے ہیں بدرجہا عقلمند ہوگا ایک گردش کے بادل کو بھی نہیں دیکھ سکتا جب کہ یہاں جنگ بادل چھائے ہوئے ہیں۔

نوجوان۔ آخر آپ لوگ اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے؟ میری سہیلی کی جان نکل رہی ہے۔ آپ کو دوسروں کا کچھ بھی خیال نہیں۔

طالبعلم۔ اونہہ وہ بہت زیادہ تھک گئی ہے۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔ اس کو سونے دو۔

پادری۔ اس کو آگ کے قریب لے آیئے۔ ڈاکٹر صاحب ذرا مدد کیجیے۔

سوداگر۔ آپ بہت تیز آدمی ہیں پروفیسر صاحب۔ اگر کچھ بات نہ کروں وہ کسی موضوع پر بھی ہو تو شاید میں زندہ نہ رہ سکوں۔ اور آپ اطمینان سے بیٹھے وہاں تاش کھیل رہے ہیں بالکل خالی الذہن۔

پروفیسر۔ میں ایک پرانا آدمی ہوں۔ مجھے یہودی ہونے کے باعث جرمنی سے نکالا گیا۔ میری سب چیزیں مدت ہوئی ختم ہو چکی ہیں۔ اور آدمی دو مرتبہ نہیں مر سکتا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ باہر صحن میں جو بیچارے آفت زدہ لوگ ہیں اس وقت کس بات پر غور کر رہے ہوں گے؟

سوداگر۔ شاید اس پر کہ اب ان پر کیا بیتے گی۔

پروفیسر۔ اور ہم اس پر بھی جو کہ ہم بھی غور کرنے کی ہمت نہیں رکھتے

پادری۔ تو بہتر میں باہر صحن میں جاتا ہوں۔ لینڈ لارڈ (مالک مکان) ذرا مجھے قہوے کا جگ دینا (قہوہ دانی)

طالبعلم۔ پادری صاحب جب ضرورت ہو تب مجھے بلا لیجیے۔

پادری۔ بہتر۔

سوداگر۔ آپ بچے بھی ہیں۔

جنرل۔ آہ۔ میری تمنا ہے کہ میں کچھ کر سکتا۔ میرے پاس ان صحن میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہے کوئی کہانی بھی تو نہیں جسے وہ خاموشی سے سن سکیں۔ کسی نے کہا ہے کہ شہری اخلاق کی انتہا یہ ہے کہ خاموشی سے مر جائیں۔

طالبعلم۔ یہ ایک انگریز کا قول ہے۔

سوداگر۔ آپ کا خیال ہے کہ پادری صاحب انہیں کیا دینے گئے

پروفیسر۔ قہوہ دانی میں سے قہوہ

جنرل۔ ان کے گناہوں کی معافی۔

طالبعلم۔ یا خدا جب ہی تو وہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

جنرل۔ چار روز ہوئے میں نے دو زنگو ولٹوں کو ایک کھیت کے پار قواعد کرتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چاروں طرف بم تھے۔ ان غریبوں کو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ کسی طرح بھی محفوظ نہیں تھے۔ وہ کبھی اپنے کھیت سے باہر نہیں گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ خاموش تھے۔

طالبعلم۔ میں تو محض آپ کی صورت دیکھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے میں کبھی کسی جنرل سے نہیں ملا ہوں۔

جنرل۔ ہاں۔

طالبعلم۔ پانچ برس تک دن رات پڑھکر اور پھر بہت دن تک علاج معالجہ کر کے اور آپریشن کر کے اس قابل ہوا ہوں

کہ ایک زندگی کو بچا سکوں ۔ مگر آپ کے نقشے پر ایک
چھوٹا سا پن ادھر سے ادھر رکھ دینے سے ایک رجمنٹ
کا رجمنٹ اجڑ جاتا ہے ۔ اور خاک میں مل جاتا ہے ۔
آپ انسان نہیں ہیں دیوتا ہیں ۔

جنرل ۔ مجھ پر الزام نہ لگایئے ۔ میں مجبور ہوں ۔ میری کوشش
تو یہ ہے کہ آپ کو حفظ دامن ملے ۔ میرا قصور نہ نکالیے

طالبعلم ۔ باہر جایئے اور ان غریبوں کو حفظ دامن دیجیے
پادری بھی وہیں گیا ہے ۔ آپ شاید اس کی کچھ مدد
کر سکیں گے ۔

جنرل ۔ مجھے وہ لوگ دیوتا تھوڑی مانتے ہیں ۔

طالبعلم ۔ جایئے ۔ جایئے ۔ ان کو امن دیجیے وہ لوگ اس کے
متلاشی ہیں ۔

جنرل ۔ میں مر جاؤں گا اگر اب یہاں ٹھیروں گا ۔ یہ ٹھیک
ہے کہ میں کوئی بری بات نہیں کر سکتا مگر میں پاگل ہو جاؤں گا
اگر یہاں ٹھیرا ۔ (وہ باہر جاتا ہے)

پروفیسر ۔ کیا آپ بھی اس کو تلاش کر رہے ہیں ۔

سوداگر ۔ کہہ نہیں سکتا ۔ آپ کس چیز کی تلاش میں ہیں ۔

پروفیسر ۔ ایک ہفتہ پہلے میں ایک ستارے کو تلاش کر رہا تھا
اور قریب قریب میں نے اسے پا لیا تھا ۔ اب میں کچھ
کھانے کو اور کسی سایہ دار جگہ کو تلاش کرتا ہوں ۔
فلحال مجھے یہ میسر ہے اور میں اب میں کسی چیز کو تلاش
نہیں کر رہا ہوں جب تک کہ پھر تلاش کرنے پر مجبور
نہ ہو جاؤں ۔

طالبعلم ۔ اگر آپ لوگوں کو کچھ بھی عقل ہے تو آپ وقت کو
غنیمت جان کر سو جائیں گے ۔ دیکھیے صرف ہم لوگ ہی
جاگ رہے ہیں ۔ وہ دیکھیے نوجوان اور دوشیزہ ایک
دوسرے سے قریب سو رہے ہیں ۔ کل تک اگر یہ ایسا
کرتے تو ہم سب لوگ اس کو گناہ کہتے اور اگلے ہی دن
ان کو ہر حالت میں شادی کرنے پر مجبور کر دیتے ۔

سوداگر ۔ آپ خود کیوں نہیں آرام کرتے ۔ آپ دن بھر
محنت کرتے رہے ہیں ۔

طالبعلم ۔ میں بس سونے ہی جا رہا ہوں ۔

پادری ۔ ڈاکٹر ۔ ڈاکٹر ۔ ڈاکٹر ..... جاگو ۔

طالبعلم ۔ میں ایک منٹ میں آیا تماشا تیار ہے ۔

پادری ۔ ہش جاگو ۔ ذرا سوچو ذرا سمجھو تم کہاں ہو ۔ اور لوگوں
کو مت جگاؤ ۔

طالبعلم ۔ اوہ ۔ میں سمجھا تم پریشان سے ہو ۔ کوئی بیمار ہے کیا ؟

پادری ۔ ہاں ۔ صحن میں ایک عورت کے بچہ ہونے والا ہے ۔
بیچاری دو سو میل تک کا سفر کر کے کل آئی وہ بھی مال گاڑی
میں ۔

پروفیسر ۔ آپ دیکھتے ہیں ۔ قدرت کا قانون ٹلتا نہیں ہے ۔
جنگ کے واسطے بھی نہیں ۔

پادری ۔ ہش میں سمجھا تم سو رہے ہو ۔ اگر کچھ کام آسکتے ہو تو
آؤ اور خاموش رہو ۔ جنرل نے آگ جلائی ہے اور
عورت اب اکیلی کے نیچے ہے ۔

پروفیسر ۔ اپنے بنائے ہوئے ملک آؤٹ کے ضابطے خود
توڑ رہا ہے ۔ میں مدد کرنے کو تیار ہوں ۔ مگر میں
خون تو نہیں دیکھ سکتا ۔ میں بیہوش ہو جاؤں گا ۔

دوشیزہ ۔ میں مدد کروں گی ۔ کبھی میں نرس تھی ۔ مگر لیو کو مت جگاؤ

پادری ۔ اچھا ۔ خاموشی سے چلی آؤ ۔

طالبعلم ۔ نرس ۔ ذرا اس کو سنبھالو ۔

جوزف ۔ کیا وہ ....

پروفیسر ۔ سب ٹھیک ہے ۔ صرف ذرا سفر کی تکلیف ہے ۔
میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں یہ سب دیکھ سکتا ہوں

طالبعلم ۔ ٹھیک ۔ اس کو سنبھالو ۔ اتنے میں ..... سانس لیجیے
ہاں ذرا سانس لیجیے ۔ اور سانس لیجیے ۔ (بچہ روتا ہے)

طالبعلم ۔ ملے آسمانی باپ تیرا شکر ہے ۔

دوشیزہ ۔ آمین ۔

پادری۔ آمین۔

پروفیسر۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جناب۔ معاف کیجیے میں آپ کا نام نہیں جانتا

جوزف۔ خاکسار کو جوزف کہتے ہیں۔ میرا لڑکا۔

پروفیسر۔ آپ بہت دور سے آئے ہیں؟

جوزف۔ جناب بہت دور سے۔ مارشکا۔ میری۔

طالبعلم۔ اس سے بات کیجیے۔ اس کو بولنے کا موقعہ دیجیے

جوزف۔ مارشکا! میں ہوں جوزف۔ بولو۔

مارشکا۔ پیاری۔ دیکھو وہ رو رہا ہے۔ لڑکا ہے لڑکا۔

مارشکا۔ ہاں میں جانتی ہوں۔

جوزف۔ (طالبعلم سے) وہ بہت تھکی ہوئی ہے۔ اس کو بہت دن سے ٹھیک کھانا بھی نہیں ملا ہے۔ اس کو دودھ نہیں ہے۔

طالبعلم۔ اچھا۔ پروفیسر صاحب۔ آپ گائے کو دُہ سکتے ہیں۔

پروفیسر۔ آہ میرے خدا۔

طالبعلم۔ جوزف۔ تم تو کسان ہو۔

جوزف۔ نہیں ڈاکٹر صاحب میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ بیسٹوزمیں۔ میں وہاں کام کرتا رہا جب تک جرمنوں نے نہیں لے لیا۔

جنرل۔ میں کھیتوں اور گاؤں میں پلا ہوں۔

طالبعلم۔ تو پھر آئیے۔

پادری۔ یہ تو قہوہ۔ خاتون۔ یہ پی لو۔ کچھ گرمی آجائے گی

جوزف۔ پی لو

پادری جی ..!

جوزف یہ دیکھتے ہوئے کہ بموں کی وجہ سے سب کچھ گڑبڑ ہے

پادری۔ ہاں۔؟

جوزف۔ کیا آپ لڑکے کو منع نہیں کریں گے۔ میں اس کو بے نام کے پکارتا ہوں

پادری۔ بہت ٹھیک۔ بہت ٹھیک۔ ہاں تو آپ کی تجویز کیا ہے۔؟ اس کا نام (آپ نے اس کا کیا نام رکھا)

جوزف۔ میرے والد کا نام تھا گریگوری۔ یہ بھی اچھا نام ہے۔

مارشکا۔ (نقاہت سے) نہیں۔ گریگور تھا۔

جوزف۔ کیا۔ پیاری تو پھر کیا؟

مارشکا۔ اس کا نام جانشکا ہوگا۔

جوزف۔ لیکن مارشکا ہمارے خاندان میں کوئی بھی اس نام کا نہیں ہے۔

پروفیسر۔ (جنرل سے کان میں کہتا ہے) جنرل مجھے کچھ ڈر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یہ جگہ اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے۔

جنرل۔ اوہ

پروفیسر۔ میں قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ میں پہلے کہیں اور بھی دیکھ چکا ہوں۔

جنرل۔ ہاں میں بھی دیکھ چکا ہوں ..... تو دودھ تیار ہے

طالبعلم۔ اچھا ہو اگر آپ تھوڑا گرم پانی اس میں اور ملا دیں۔

نہیں۔ بلکہ ابلا ہوا پانی۔ نرس ذرا تم یہ کام کرو۔

پروفیسر۔ کتنا پیارا بچہ ہے۔ کاش میرے پاس دینے تو کچھ تحفہ ہوتا۔

پادری۔ شاید آپ کے پاس ہو۔ دیکھیے (تلاش کیجیے جیبیں ٹٹولیے)

پروفیسر۔ میرا کام تو وہ پسند نہیں کرے گا۔ پھر مجھے بھی اس کی ضرورت ہوگی۔

جوزف۔ وہ ابھی کیا پسند کرے گا۔ سوائے اپنی ماں کی مرضی کے

پروفیسر۔ تو پھر آپ اس کو حفاظت سے رکھیے۔ ایک دن وہ اس کا استعمال سیکھ جائے گا۔

جوزف۔ شکریہ۔ مگر میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے۔

پروفیسر۔ یہ میرا کھلونا ہے یہ اس دنیا کی ایک نشانی ہے جو ہزاروں مرتبہ تباہ ہوئی اور جلی مگر پھر بھی موجود ہے آہ پیارے بچے میں تجھے خوش نصیبی کی دعا ہی دے سکتا ہوں۔

جنرل۔ اور مجھے بھی کچھ دینا چاہیے۔ میں اپنی ہیٹ پر سے
یہ طرہ امتیاز اتار کر دیتا ہوں۔ اس کی قیمت پندرہ
لاکھ جانیں ہیں۔ مگر اب مجھے یہ درکار نہیں۔ خدا اس
بچے کو صاحب نصیب کرے۔

پادری۔ ڈاکٹر صاحب۔ آپ کچھ نہیں دیں گے۔

طالبعلم۔ میں نے اسے زندگی نئی دی۔

جنرل۔ یہ کیا شور ہے؟ ذرا سننا!

پروفیسر۔ آپ نے گانے کی آواز سنی؟ میں نے بھی سنی۔

جنرل۔ خاموش۔

نوجوان۔ جلدی کرو جلدی کرو۔ جرمن آ گئے۔ میں تمہیں یہاں سے
دور کر دوں گا۔

طالبعلم۔ یہ بدتمیزی بند کرو۔ دیکھتے نہیں یہاں مریض پڑا ہے

جنرل۔ جرمن؟ یہاں کل تو وہ سو میل دور تھے۔

پروفیسر۔ جرمن تمہارے دشمن ہیں۔ اپنا فرض ادا کرو۔

جنرل۔ ڈاکٹر صاحب آپ

طالبعلم۔ میرا کوئی دشمن نہیں۔

پادری۔ ہم خاموشی سے ہمیں کیوں نہ ٹھہریں۔ کسی طرح بھی
ہم کچھ کر تو سکتے نہیں۔ خدا ان کا نگہبان ہے۔ جو اس
کی راہ میں کام کر رہے ہیں۔

جوزف۔ وہ لوگ کیا کریں گے۔

پادری۔ معلوم نہیں۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ (سوداگر سے)
جناب آپ نے بچے کو کچھ تحفہ نہیں دیا ہے۔ اگر آپ کو
دینا ہے تو دے دیجیے اس سے پہلے کہ میں اسے تبتسمہ
کروں۔

سوداگر۔ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔

پادری۔ تو کم از کم اس کو دعا تو دو۔

سوداگر۔ میں اس کو دعا دیتا ہوں۔ خدا کرے یہ بڑا ہو کر میرے
لڑکے کے مانند ہو۔ میں اپنا رنج اور جلاوطنی بھی ساتھ
دیتا ہوں۔ اچھے تحفے ہیں نہ میں اس بچے کا شکر گذار ہونگا

اور نہ ہی رہوں گا۔

پادری۔ جانسکا۔ جانسکا۔۔۔۔۔ آپ کا ارادہ کیا ہے

جوزف۔ ڈیوڈ وڈز۔ مقدس باپ

پادری۔ جانسکا ڈیوڈ وڈز! میں تجھ کو مقدس باپ بیٹے اور
روح القدس کے نام میں منسوب کرتا ہوں۔

سب لوگ۔ آمین۔

دروازہ زور سے کھلتا ہے۔

جرمن افسر۔ ہیل ہٹلر۔

پادری۔ آپ یہاں کیا چاہتے ہیں۔

جرمن افسر۔ جو شخص مزاحمت کرے گا گولی کا نشانہ بنے گا۔
آپ پادری صاحب، اس یہودی کو ہمارے حوالے
کیجیے۔

پادری۔ کیا؟ یہودی؟ کون یہودی!

افسر۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولیے۔ میں خوب جانتا ہوں وہ
یہاں ہے میں آپ کو پانچ منٹ دیتا ہوں۔
پانچ منٹ میں اس کو حاضر کیجیے۔

پادری۔ اس نے کوئی جرم کیا ہے۔ ضرور کیا ہوگا؟

افسر۔ غضب۔ کیا یہ جرم نہیں ہے کہ آدمی اس قوم
کا فرد ہو۔ جس نے وطن کو برباد کرنے کے لیے یورپ
کو دو مرتبہ جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔

طالبعلم۔ کیا آپ اپنا شور کم کریں گے۔ یہاں پر ایک مریضہ
پڑی ہوئی ہے۔

افسر۔ میں حکم دے چکا ہوں۔ ایک منٹ ختم ہو گیا۔

جنرل۔ ہر آنیسر! میں سپاہی ہوں اور سپاہی کی آبرو کی قسم کھا کر
کہتا ہوں کہ یہاں پر کوئی یہودی نہیں ہے۔ اور
میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ان شہریوں کے ساتھ جنگ کے
قاعدوں کے مطابق سلوک کیا جائے۔

افسر۔ ہاں۔ جنگ کے قاعدوں کی پابندی کی جائے گی۔
آپ میرے قیدی ہیں۔ آپ کا نام؟

جنرل۔ یا اللہ

افسر۔ ہیل ہٹلر۔ میں آپ کو سلام کرتا ہوں۔ آپ تنہا اپنا دشمن ہیں۔ جس کی میں عزت کرتا ہوں۔ اور تنہا پول میں جو آپکو گرفتار کر سکتا ہے

جنرل۔ کیا بے تکلفی اور بدتمیزی ہے!

پروفیسر۔ جنرل صاحب معاف کیجیے گا۔ لیکن آپ غلطی پر ہیں میں آپ کی عزت اس آدمی کے سامنے کم نہ ہونے دوں گا۔ میں یہودی ہوں۔

جرمن افسر۔ آپ ہی آئنسٹائن ہیں۔ بالشویک اور غدار جسکو پچھلے سال نیوامبرگ یونیورسٹی سے نکالا گیا۔

پروفیسر۔ ہاں میں ہی آئنسٹائن ہوں۔ میں اجرام فلکی کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ کیا تم میرے شاگردوں میں سے نہیں ہو۔

افسر۔ جی مگر میں اس بحث میں نہیں پڑ سکتا۔ ہمارے رہبر نے آنکھیں کھولدی ہیں۔ آپ زیر حراست ہیں۔

پروفیسر۔ آپ وارنر ترو ہیٹ ہیں۔ ہیں نا۔

افسر۔ میں ایک جرمن ہوں۔

پادری۔ آمین تم کو . . . .

افسر۔ پادری صاحب اپنی قسمت کو دعا دیجیے کہ یہ خود بول پڑا۔ اگر آپ آئندہ جھوٹ بولیں گے تو آپ کا یہ چوغہ کام نہیں دے گا۔

(باہر ایک فایر کی آواز ہوتی ہے اور شور کہ) یہ کیا؟

جنرل۔ میں جانتا ہوں کیا ہو رہا ہے۔ اپنے آدمیوں کو قابو میں رکھیے برخوردار

افسر۔ اگر آپ آئندہ میری توہین کریں گے تو میں آپ کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ میں اب جاتا ہوں۔ اور سب کو ذاتی طور پر اس یہودی کے لیے ذمہ دار قرار دیتا ہوں۔

پروفیسر۔ یہ میری ناکامی ہے۔ یہ میرا شاگرد تھا اور میں اسے غور و فکر کی تعلیم دے رہا تھا۔ جب یہ نازیوں کے ہتھکنڈوں میں پھنس گیا۔

جنرل۔ سیاہ پوش

دوشیزہ۔ وہ جانور ہے۔ درندہ۔ کاش میں مرد ہوتی۔

نوجوان۔ اس قسم کے آدمی کے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ ایک دیوار اس کے پیچھے اور آگے سے گولی کا نشانہ۔

پروفیسر۔ نہیں میں اس کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ اسے اپنے فرض کا انتہائی احساس ہے۔ اور یہ تمام منطق اور تمام رحم کے خلاف کافی ہے۔ وہ صرف ایک نمونہ ہے اس کا جو تمام یورپ میں لاکھوں آدمی بن جائیں گے اگر یہ جنگ جاری رہے گی۔

پادری۔ وہ تمہاری جان لے گا۔

پروفیسر۔ ممکن ہے۔ وہ یہ سلوک اکثر ان لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں جو انہیں غور و فکر سکھاتے ہیں۔

افسر۔ اندر آتے ہوئے۔ جو شخص اب لائن توڑے گا کورٹ مارشل کر دیا جائے گا۔ کارپول۔ اپنا ریوالور نکالو۔ آپ وہ کیا ہے؟

طالبعلم۔ وہ ایک مریضہ ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔

افسر۔ جھوٹ۔ آخری پولش معذور کے ہاتھ میں میں نے دیکھا بہت سے چھوٹے چھوٹے بم تھے۔

جوزف۔ اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا۔

افسر۔ دور کھڑے ہو اگر خیریت چاہتے ہو۔ ہم تمہیں سکھائیں گے تمہیں وہ سلوک کیا معلوم ہوتا جو تم نے جرمن اقلیت کے ساتھ پولینڈ میں کیا۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے

پادری۔ وہ اندر چلا گیا۔

جوزف۔ ناپاک ۔ بد . . . .

پادری۔ ذرا اسے سنبھالو۔ خدا ان کے درمیان حفاظت کرنے کو موجود ہے۔

دوشیزہ۔ اگر اس نے ماں یا بچے کو کچھ بھی نقصان پہونچایا

تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے ماروں گی ہمیں خاتون
مارا جا سکتا ہے۔ بے خانماں برباد کیا جا سکتا ہے۔
مگر پھر بھی ہم نفرت تو کر سکتے ہیں۔

نوجوان۔ ذ..لنگ۔

جوزف۔ یکدم مرگئی۔ (ہائے اللہ)

طالبعلم۔ ہمت سے کام لو۔

پادری۔ میں اندر جاتا ہوں۔

دوشیزہ۔ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ میں جاتی ہوں۔

طالبعلم۔ نہیں یہ میرا معاملہ ہے۔ (وہ اندر جاتا ہے)

پروفیسر۔ میں نہیں سمجھتا کہ ورنر اس کو مار ڈالے گا۔ اور
اگر وہ مار ڈالے تو یہ میری مکمل ناکامی ہے۔

طالبعلم۔ میں.... اس کو...... نہیں مانتا

جوزف۔ کیا.... وہ....؟

طالبعلم۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہے اور بچہ کیساتھ کھیل رہا ہے
مجھے اپنی آنکھوں پر یقین اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر کسی جان
لینے کی مرضی ہو تو وہ ایسا نہیں......

پادری۔ جس کو رکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی۔ چند چیزیں
ہوتی ہیں جن کو کوئی بھی نہیں مار سکتا۔

نوجوان۔ نہیں آپ وارسا میں نہیں تھے۔ نہیں تو دیکھتے
کہ انہوں نے وہاں بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے

پادری۔ سنو

مارشکا۔ کتنا پیارا ہے۔

افسر۔ بیس برس میں یہ بھی سپاہی ہو جائے گا میں سمجھتا
ہوں کہ تم اس سے یہ چاہتی ہو کہ ملک کا بدلہ لے۔
ہوں... میری مادر وطن سے نفرت کرنے کیلیے
ایک اور پول۔

مارشکا۔ نہیں۔ کیا جب تم اس کے برابر تھے نفرت کرتے تھے

افسر۔ شاید نہیں۔ مگر اس وقت میری آنکھیں کھلی نہ تھیں۔

مارشکا۔ خدا کرے اس کی آنکھیں ہمیشہ ہی بند رہیں۔

افسر۔ تم عورت ہو۔ تمہارے دل میں حب الوطنی نہیں ہے

مارشکا۔ شاید

افسر۔ اچھا تو یہاں کچھ نہیں ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ خدا
کرے۔ تم خیریت سے اس سے فارغ ہو۔

مارشکا۔ شکریہ

افسر۔ ہاں۔ ایک بات اور ہے۔ اگر تمہارے خاوند نے
کچھ چالاکی سے کام لیا تو وہ گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔
یہ چاقو بچے کے لیے رکھو جب وہ بڑا ہو جائے گا۔
اور اس سے کہہ دینا کہ اگر وہ پوری اور خوش زندگی
بسر کرنا چاہتا ہے تو اس چاقو کو سپاہیوں کی پسلیوں
سے دور ہی رکھے۔

مارشکا۔ خدا حافظ۔ فی امان اللہ

افسر۔ مجھے اس دعا کی ضرورت بھی ہے۔ آپ پہلی بالشویک
عورت ہیں جس نے مجھے دعا دی (باہر آتا ہے) اب
آپ یہودی چلیے۔ گارڈ۔

پروفیسر۔ خدا حافظ پادری صاحب۔ میں خوش ہوں۔ میں ناکام
نہیں ہوا ہوں۔ مکمل طور پر نہیں۔

افسر۔ اچھا اب چلیے۔ اور دیکھیے پادری صاحب۔ اگر میرے
جانے کے بعد کچھ گڑبڑ یہاں ہوئی تو میں واپس آؤں گا
اور اس سرائے کو تمہارے سامنے جلا دوں گا۔ کارپول
سرائے کے مالک نے تین آدمیوں کا راشن دیدیا؟

پروفیسر۔ میرے خیال میں اس زمانے میں ہر کوئی شخص
بغیر نقصان کے مر سکتا ہے۔

پادری۔ خدا حافظ۔ خدا کا سایہ تم پر رہے۔ یسوع مسیح کا واسطہ

پروفیسر۔ مگر آپ بھولیے نہیں میں یہودی ہوں۔

پادری۔ خدا کا بیٹا بھی تو اسرائیل تھا۔

افسر۔ اچھا۔ اچھا اب چلیے۔ جنرل۔ تم بھی میرے ساتھ آؤ
لفٹنٹ تم سے کچھ سوال کرے گا۔

جنرل۔ مگر وہ کچھ مفید نہ ہوگا۔ زندہ باد پولینڈ۔

افسر۔ سب لوگ گواہ رہیں میں ذلالت پسند نہیں کرتا۔ اگر کوئی اور افسر آئے گا وہ اتنا نرم نہیں ہوگا۔ ہیل ہٹلر۔

پروفیسر۔ خدا حافظ۔ بچے کو مت جگاؤ۔

جوزف۔ مقدس باپ کیا یہ معجزہ تھا۔

پادری۔ ہاں۔ بیٹا۔

دوشیزہ۔ تو۔ وہ لوگ چلے گئے ... میں کبھی کسی جرمن کو دور ... دنہیں دیکھا تھا۔ تو ہماری اولاد سب لڑکے ہوں گے۔ ضرور ہوں گے۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں تھا کہ ہم نفرت بھی کر سکتے ہیں۔

نوجوان۔ زندہ باد پولینڈ۔ کاش میں بھی ان دو بہادروں کے ساتھ مرنے کے لیے چلا جاتا۔

پادری۔ بچی۔ تمہارے لڑکا ہوگا۔ مگر جب وہ تمہاری گود میں تبھی ہوگا۔ کہ پھر تمہیں نفرت کی ضرورت نہیں رہے گی

سوداگر۔ میں نے اس کے مستقبل کے متعلق دعا کی تھی۔ اس بچے کی ماں نے کہا کہ اس کی آنکھیں ہمیشہ بند ہی رہیں۔ وہ تو کھلی ہوئی ہیں۔

پادری۔ ہاں میں تو۔

طالبعلم۔ ہش۔ بچہ سو رہا ہے۔

سلام (مچھلی شہری)

غزل

حقیقت جس قدر مجھ پر نمایاں ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیاز کفر و ایماں ہوتی جاتی ہے

حجابات نظر آہستہ آہستہ سرکتے ہیں
حقیقت رفتہ رفتہ آپ عریاں ہوتی جاتی ہے

تری نسبت نے اعزاز قبول عام بخشا ہے
حکایت میری افسانوں کا عنواں ہوتی جاتی ہے

جنون عشق سے بڑھتا ہے جوں جوں شوق آزادی
فریب واہمہ دیوار زنداں ہوتی جاتی ہے

اسیر غنچہ و گل کب نگاہ شوق رہتی ہے
نظر کھلتی ہے تو سیع گلستاں ہوتی جاتی ہے

نہ جانے اس کی آخر ہمنوا تعبیر کیا ہوگی
جو میری زندگی خواب پریشاں ہوتی جاتی ہے

مئے و معشوق و نور و نغمہ و لطف و محبت سے
گنہ گاری مری جنت بداماں ہوتی جاتی ہے

اگر مقصود ہی ان کا شکست عہد ہوتا ہے
تو پھر ہر بات میں توثیق پیماں ہوتی جاتی ہے

یہ آوارہ نگاہیں سر و خشت گھوسلے رہتی ہیں
پریشاں خاطری یارب نمایاں ہوتی جاتی ہے

وطیرہ ہی عجب ہے آتش سوز محبت کا
سلگتی جائے جتنی اور پنہاں ہوتی جاتی ہے

وہ بے پردہ سہی لیکن مداوا نور کیا اس کا
جو حیرانی نقاب روئے تاباں ہوتی جاتی ہے

نور (اکیلوی)

کتابوں کی رسید

تبصرے کی غرض سے ذیل کی کتابیں آئی ہیں۔ اس مہینے میں گنجائش نہ نکل سکی۔ آنے والے مہینے میں ان پر تبصرہ کر دیا جائے گا۔

(۱) مثنوی عائشہ صدیقہ (۲) دامن باغباں
(۳) نغمہ (۴) دودھ کی قیمت۔

ہمارے آنے والے پروگرام
ونراج پکچرز
وطن کیلیے
نرین چندر۔ کملا۔ گوپ۔ گلشن
وغیرہ
موہن پکچرز
ویربالا
اندورانی۔ فیروز۔ کابلی
وغیرہ
کرشنا ٹاکیز
کرشن نگر لاہور
سندھ پکچرز کی بہترین پیشکش
سندیہ
اداکاران
یاسمین۔ نذیر۔ عاشق حسین۔ بے بی مدہوری
سوشیلا
سوروج موویٹون کا مشہور فلم
سیف سلیمانی
اداکاران
سردار اختر۔ اشرف خاں۔ زیب النسا
عبدالرحمٰن کابلی
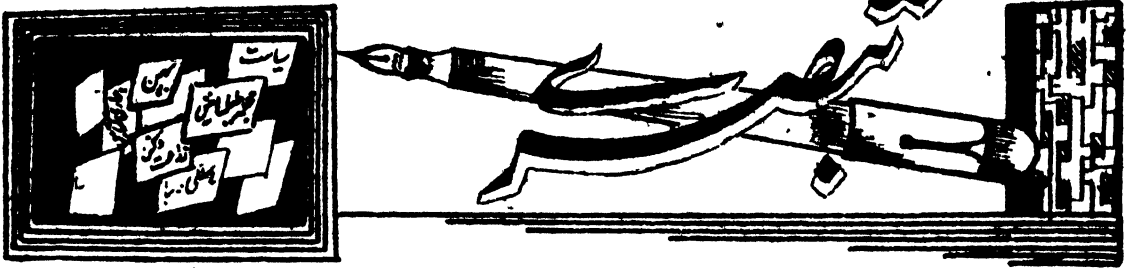
رسالے

سیاست سہ ماہی رسالہ کچھ عرصے سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں ریڈر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ رسالے کے میعار کے متعلق صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ اس میں ٹھوس قسم کے سیاسی اور تاریخی، معاشی اور سماجی مقالے چھپتے رہتے ہیں۔ جن میں سے اکثر مضامین پروفسران جامعہ عثمانیہ کی علمی تحقیقات اور قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

کاغذ کی مہنگائی کے باوجود یہ رسالہ پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اب اس کے انتظام کی باگ جناب اقبال سلیم صاحب گاہندری کے ہاتھ میں آئی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ سلیم صاحب کے حسن انتظام سے یہ رسالہ پابندی کے ساتھ چھپتا رہے گا۔ چندہ سالانہ ۱۲؍ ہے۔ مہتمم صاحب ادارہ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے

مجلہ طیلسانین اس مجلے کو جاری ہوئے چھ سال ہوئے۔ اس وقت سے بغیر کسی پابندی کے یہ رسالہ جاری ہے۔ جس طرح ہر قوم اور ہر جماعت اپنے بچاؤ اور ترقی کی فکر میں لگی رہتی ہے اسی طرح کسی ادارے کی کوششیں بھی جاری رہ سکتی ہیں۔ چونکہ اداروں کا ایک دوسرے میں فرق پیدا کرنا ضروری ہے اس لیے ان کے ناموں کے ساتھ کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ اور ایسے اداروں کے جو آرگن ہوا کرتے ہیں وہ اپنے اداروں ہی کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے زیر بحث مجلے کا نام "مجلہ طیلسانین عثمانیہ" ہونا چاہیے تھا۔

اس کی اداری باگ ایک مجلس کے سپرد ہے جس کے پانچ چھ ارکان ہوا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اعزازی مہتمم بھی عثمانی برادری ہی کا ایک فرد ہوا کرتا ہے۔ شاید انگریزی کی مشہور مثل "ٹو مینی کوکس اسپائل دی براتھ" اسی رسالے پر صادق آسکتی ہے۔ اس لیے کہ آدھے درجن افراد کے ہوتے ہوئے بھی یہ رسالہ وقت پر نہیں نکلتا۔ اگر ہم غلطی نہیں کر رہے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض وقت سال میں ایک آدھ نمبر بھی مشکل ہی سے نکلا ہو ورنہ دو ایک نمبر نکل جایا کرتے ہیں۔ اس اہم رسالے کی حالت بالکل ایک یتیم بچے کی سی ہے اور اس کے ایڈیٹر یا نگران کار برائے نام ہیں۔ کسی متعلق کو اس سے دلچسپی نہیں اس پر خوبی یہ کہ اس بری طرح قبضہ جما رکھا ہے چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ جب خود سے کوئی کام نہ ہو سکے تو یہ ذمہ داری اور ہاتھوں میں دیدی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انجمن نے مجلس ادارت کے پرانے ناموں کی ڈائی بہت زیادہ روپیہ خرچ کر کے تیار کروائی ہے اس لیے روایت قدیم اور رسم کہن کی بدعت کو دور کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔

مجلے کے جو مقاصد ظاہر کیے گئے ہیں وہ اس طرح پر پورے نہیں ہو رہے ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ موجودہ صورت میں مجلہ نگران کاروں کے ناموں کے پروپگنڈے کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ مجلے سے متعلق نئی تنظیم کی جائے اور نئے ہاتھوں میں اس کام کو دے کر پروان چڑھانے کی کوشش کی جائے۔

ہماری کتابیں تقطیع ۱/۱۶ رائل حجم ۸۰ صفحے ٹائیٹل دیدہ زیب لکھائی چھپائی اچھی چندہ سالانہ عہ قیمت

ایک پیوند ہے یہ تشنہ لبی کی شبیر حاتمی صاحب بی۔ اے۔ سی (عثمانیہ)
کی [illegible] سے ہر مہینے سے نکل رہا ہے۔ اس رسالے
[illegible] کا مقصد جیسا کہ پہلے ہی نمبر کے اداریے میں ظاہر کیا گیا
ہے "آج کتب خانہ ان نیک ارادوں کے ساتھ اپنا ایک ماہوار
ترجمان آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے" مقاصد کی مزید توضیح
اس طرح پر کی گئی ہے۔

(۱) تبصرہ (۲) تذکرہ (۳) تکمیل۔ جس میں ان کتابوں
کی فہرست ہوگی جو مہینے کے آخر تک گشتی کتب خانے میں داخل کی
گئی ہوں۔ (۴) تعارف۔ نئی کتابوں کا (۵) مقالات۔

اس لحاظ سے ان نمبروں میں بعض مختصر مفید مضامین
بھی درج ہیں۔ رسالے کی ترتیب بڑی اچھی ہے۔ رسالہ ہر
فصلی مہینے کے پہلے ہفتے میں چھپتا ہے۔

شبیر حاتمی صاحب ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جو
تعلیم پانے کے بعد علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ حاتمی
صاحب میں کام کرنے کا حقیقی جذبہ ہے۔ ہم ان کی علمی خدمات
کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ان کی یہ
کوشش ایک دن یادگار ثابت ہو کر رہیگی۔

ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری

آجکل جنگ کی وجہ سے ریل کی جو بھی
دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان سے
ہر شخص واقف ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ریل کا اوقات نامہ
بھی ہے۔ اول تو یہ اوقات نامہ صرف انگریزی میں مہینے میں
ایک بار چھپتا تھا مگر اب کام کی زیادتی اور کاغذ کی مہنگائی کے
باعث زیادہ وقفے سے چھپنے لگا ہے۔

انجمن آسائش مسافران نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔
یعنی ہر مہینہ ہندستانی زبان میں ریل کا اوقات نامہ شائع کر رہی
ہے۔ اس اوقات نامے میں مسافروں کے لیے بعض ضروری
مختصر معلومات بھی درج ہیں۔

اس سلسلے میں ہم انجمن کو چند مفید مشورے دینا چاہتے ہیں
اول تو یہ کہ اس کتابچے کا نام ٹرانسپورٹ ڈائرکٹری کی بجائے
"رہبر مسافران" رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔ اور یہاں کی مناسبت
سے باہر سے آنے والے مسافروں کے لیے بھی چند ضروری
معلومات بہم پہونچائی جائیں۔

دوسرے یہ کہ اس انجمن کا نام "انجمن آسائش مسافرین"
بھلا نہیں معلوم ہوتا یہ "بروزن" کافرین" ہے لہذا انجمن کا نام
"انجمن آسائش مسافران" ہونا چاہیے۔ اگرچہ دستور العمل
کے ضمیمے میں یہی نام ہے مگر پہلے صفحے پر مسافرین کا لفظ استعمال
ہوا ہے۔ نہ معلوم نام رکھائی کے وقت کونسا نام ذہن میں تھا

تیسری چیز جس کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا گیا وہ یہ
ہے کہ رہبر مسافران کی ہر جلد میں دستور العمل کا دینا ضروری نہیں
اس کی بجائے دوسری معلومات درج کی جائیں تو مناسب ہوگا
بہرحال اس سودا برا نہیں بلکہ تعریف کے قابل ہے اس لحاظ
سے انجمن کے کام کرنے والوں کی یہ کوشش مبارکباد کے قابل
ہے۔ انجمن کا دفتر (۱۷۵۲) گٹھمنڈی حیدرآباد میں واقع ہے
رہبر مسافران ویلر بک اسٹال سے بھی حاصل فرما سکتے ہیں۔

انتظام کتب خانہ

شیخ محبوب صاحب قریشی نے ۱۲ صفحوں کا
رسالہ اس نام سے لکھا ہے۔ قیمت چار آنے
رکھی گئی ہے۔ کتب خانے کے استعمال سے متعلق مفید معلومات
دی ہیں۔ مختلف رجسٹروں کے نمونے بھی دیے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا
کہ ہم لوگوں کو اپنا اپنا گھریلو کتب خانہ رکھنے کا شوق اتنا ہی ہوتا
ہے جتنا کہ قریشی صاحب کو کتب خانے کے انتظام سے ہے۔

زراعت دکن

قاضی مرتضیٰ صاحب نے چار پانچ سال پہلے
اس نام سے ایک رسالہ سپرد قلم کیا تھا۔
رسالے کے پچیس صفحے ہیں لیکن ان میں بہتر ترکاریوں، پھلوں
اور مختلف قسم کے اناج پیدا کرنے کی فصلوں کا ذکر ہے۔ حشرات الارض
سے کھیتی کو محفوظ رکھنے کے طریقے۔ کاشت کے طریقے۔ اور پھر
جو کچھ حاصل ہو اس سے فائدہ اٹھانے کے مختلف طریقوں کا
بیان بھی درج ہے۔ غرض کتاب کیا ہے دریا کو کوزے میں بند
کر دیا گیا ہے۔ قیمت آٹھ آنے گٹھمنڈی حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

قصہ اللہ میاں سے منسوب ہے اور ماہر القادری نے پیش لفظ لکھا ہے۔

بہن

قصہ روزنامچے کی صورت میں ہے۔ جس کو محبوب دکنی نے لکھا ہے "یہ محض قصہ نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی ہے البتہ نام بدل دیے گئے ہیں اور سنہ لکھنے میں اجتناب کیا گیا ہے"

روزنامچہ ۵ر اکتوبر سے شروع ہوکر ۸ر مارچ پر ختم ہوتا ہے قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طالب علم جو کالج میں پڑھتا ہے اس کے گھر کی ایک ملازمہ کی لڑکی عاشق ہو جاتی ہے

چونکہ ملازمہ زادی صاحبزادے کی ہوس کا نشانہ نہیں بنی اس لیے مصنف نے لکھا ہے کہ "علاوہ دیگر مقاصد کے "بہن" کی تصنیف کا ایک بڑا مقصد اپنے ماحول کی اصلاح ہے" ملازمہ زادی کے محفوظ رہنے کی اصل وجہ اس کے پہلے عاشق اور بعد میں بھائی یا خود اس لڑکی کی اعلا کرداری نہیں بلکہ وہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے۔ جس کو اصطلاحاً تجاذب غرابت کہتے ہیں لیکن مصنف نے قصے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "یہ وجہ بغور پڑھنے پر خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے"

لاسلکی دنیا

از میر حبیب اللہ۔ مطبوعہ عہد آفریں پریس حیدرآباد

یہ کتاب بیسویں صدی کی حیرت انگیز ایجاد ریڈیو کے متعلق ہے۔ کتاب عام فہم عبارت سادہ اور پیرایہ سلیس ہے انگریزی زبان میں سائنس اور ایجادوں کے متعلق عام فہم کتابوں کی کمی نہیں لیکن ہندستانی میں افسوسناک حد تک کمی ہے۔ حبیب اللہ صاحب نے یہ کمی پوری کرنے کے لیے اچھا قدم اٹھایا ہے۔ زیر نظر کتاب میں پیش لفظ جناب نصیر احمد صاحب عثمانی نے لکھا ہے۔

پوری کتاب اٹھارہ باب پر مشتمل ہے ابتدائی ابواب میں برق اور مقناطیس کے متعلق ابتدائی اور اساسی معلومات بہم پہونچائی گئی ہیں تاکہ کتاب سے ایسے لوگ بھی استفادہ کرسکیں جو سائنس سے بالکل نابلد ہیں۔ اس کے بعد مائیکروفون اور اصول مائیکروفلو نشر اور اصول نشر، ترسیلی آلات، ریڈیو کے اجزا اور ان کے عمل سے عام فہم بحث کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ ناگزیر مقامات پر عددی ضوابط کا اندراج بھی کیا گیا ہے۔ آخری باب میں ریڈیو کے انتخاب کے لیے مشورے اور حیدرآباد کی بعض دکانوں کے پتے دیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ہندستانی اصطلاحات کی فہرست دی گئی ہے جن کے مقابل میں انگریزی اصطلاحات بھی درج ہیں۔

مصنف کا لکھا ہوا دیباچہ پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کی تصنیف کے دو مقاصد ہیں ایک یہ کہ عوام کو لاسلکی کے اصولوں سے واقف کرایا جائے۔ دوسرے یہ کہ ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ریڈیو کے تمام اجزا علیحدہ علیحدہ خرید کر اور ان کو ترتیب دے کر ریڈیو تیار کریں۔ اور اگر کبھی خراب ہو جائے تو اس کو درست کرلے سکیں۔

مصنف اپنے پہلے مقصد میں کامیاب نظر آتا ہے لیکن دوسرے مقصد کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس صنعتی و حرفتی دور میں بہتر ہوتا کہ یہ کتاب عملی افادے کے نقطۂ نظر سے لکھی جاتی۔ کتاب کی قیمت [illegible] رکھی گئی ہے جو حجم کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ کتاب بحیثیت مجموعی اچھی اور دلچسپ ہے۔ گو کہیں کہیں زبان اور طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں اور بعض مقامات پر مضمون کا تسلسل بھی باقی نہیں رہا ہے

معمہ

ہم چاہتے ہیں کہ عوام میں علمی استعداد بڑھانے کی خاطر کراس ورڈ ربن لفظی معموں کا سلسلہ شروع کریں مگر اس سے پہلے ہم اس بارے میں ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کی رائے معلوم کرلینا ضروری سمجھتے ہیں۔

امید کہ آپ اپنی قیمتی رائے اور تجویزوں سے ہمیں جلد سے جلد مطلع فرمائینگے

YOUR FAVOURITE THEATRE

PHONE 2761
Sultan Bazar, HYDERABAD-Dn.
(*Subject to Alteration*)

PROGRAMME for FEBRUARY 1943

MAKE A NOTE IN YOUR DAIRY

DON'T FAIL TO SEE

Dates	Programme	Dates	Programme
SAT. 27th Feb. TO TUE. 2nd March '43	ONLY FOR 4 DAYS Ray Milland - John Wayne in REAP THE WILD WIND (In Technicolour) Spectacle Beyond Compare You'll live every purse-beating moment ! *(Paramount)*	SAT. 20th TO TUE. 23rd March	Ann Sheridan - Pat O'Brien INDIANAPOLIS SPEEDWAY Excitement Drama & Romance *(W. Bros)*
SAT 13th TO TUE. 16th March	Errol Flynn Olivia De Havilland SANTA FE TRAIL Adventure Spectacle & Action based on History *(W. Bros)*	WED. 24th TO FRI. 26th March	Fred Mac Murray - Mary Martin NEW YORK TOWN Live, Laugh and Love on Exactly Nothing a week *(Paramount)*
WED. 17th TO FRI. 19th March	Ray Millard - William Holden I WANTED WINGS Thrills ... Laughter Adventure... Love *(Paramount)*	WED. 3rd TO FRI. 5th March	Bing Crosby - Mary Martin BIRTH OF THE BLEUS All star, All Laugh, All Round Musical Sensation *(Paramount)*

Dates	Programme
SAT. 6th TO TUE 9th March	Edw. G. Robinson - Ida Lupino THE SEE WOLF Jack London's Greatest Adventure with thrills *(W. Bros*

DONT FAIL TO SEE

THE LATEST WAR NEWS

Showing Every Friday to Tuesday.

قواعد

۱۔ یہ رسالہ ہر فصلی مہینے کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

۲۔ حجم حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ گھٹتا بڑھتا رہیگا۔

۳۔ دل آزار مباحث کے سوائے ہر موضوع پر مضامین قبول کیے جائیں گے

۴۔ بے لاگ تنقید اور تبصرے کے لیے اس رسالے کے صفحے ہر وقت کھلے رہیں گے۔

۵۔ مستقل خریداروں کو وقت پر رسالہ نہ پہنچے تو اطلاع دینے پر رسالہ بھیجد یا جائے گا۔

۶۔ مضامین کی واپسی اور جواب طلب امور کے لیے ٹپے کے ٹکٹ لازماً بھیجے جائیں۔

۷۔ اشتہار صاف ہوں ورنہ دفتر کسی قسم کی غلطی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۸۔ جب تک اشتہاروں کی اجرت پہلے وصول نہ ہو اشتہار نہ چھاپے جائیں گے۔

۹۔ مضامین وغیرہ صرف ایک ہی رخ پر خوشخط لکھے جائیں۔

۱۰۔ اگر رسالے کی خریداری منظور ہو تو ایک سال کا چندہ پہلے ہی بھیجد یا جائے۔

عہد آفریں برقی پریس میں چھپا